ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.5,Issue No.3(2023)
(October to December)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی غیر مدون نثری تحریریں: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Research & Critical Study of Dr. Tabassum Kashmiri's unedited Prose Writings

ڈاکٹر سفیر حیدر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور
محمد ذیشان وکیل
وزیٹنگ لیکچرار، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Dr. Safeer Hyder
Associate Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore
Muhammad Zeshan Wakeel
Visiting Lecturer, Department of Urdu, GC University, Lahore

Abstract:
Research and critical articles published in magazines and journals are crucial in deciding the rank and quality of the literature of a language. Some of these articles grace the books and pave the way for students and teachers to understand literature, while most of them guide only the readers of a period and then, as the lost-pages, go to oblivion under the dust of time. Although Dr. Tabassum Kashmiri's main introduction is his literary history, his research and critical articles, which are more than 100 in number, published in various journals, are a testament to his critical and investigative nature. Some of these essays have become the embellishment of his books, and most have been engulfed in the folds of time. In this article, Dr. Tabassum Kashmiri's unpublished prose collection (essays) has been evaluated through research and critical study.

Keywords: Dr. Tabassum Kashmiri ,critical articles, magazines, crucial, understand literature, literary history, critical and investigative, evaluated

رسائل و جرائد نے ہمیشہ سے ادب و دیگر علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان میں شائع ہونے والے مضامین جہاں ان موضوعات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں وہیں اپنے دور کے ادبی رجحانات کے بھی عکاس ہوتے ہیں۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائی تو مصنفین (نقاد، محققین) کی ابتدائی کاوشیں مضامین ہی کی صورت میں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ادب میں شامل ہونے والے نئے موضوعات پر ابتداً جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب مضامین ہی کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ مختصر مضامین جو مختلف موضوعات، جدید مباحث اور دیگر علوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہ صرف طالب علمانہ ضروریات کو پورا کرتے ہیں بلکہ ادب اور دیگر علوم کے قارئین کی تشنگی کو بھی دور کرتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو مختلف مصنفین چاہے وہ شعراء ہوں یا نثر نگار ان کے ہاں پائے جانے والے موضوعات پر ابتدائی بحثیں مضامین ہی کی صورت میں ملتی ہیں۔ مضامین جہاں ان مصنفین کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں ان سے مضمون نگار چاہے وہ محقق ہو یا نقاد اس کے نقطۂ نظر، محققانہ و ناقدانہ کاوشوں اور علمی بصیرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مختلف موضوعات پر سو(۱۰۰) سے زائد مضامین لکھے ہیں۔ زمانۂ طالبِ علمی سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ان کا پہلا مضمون "پاکستان کا پہلا اردو اخبار کوہِ نور" ہے۔ جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی "بزمِ عروجِ ادب" میں پڑھا تھا۔ بعد ازاں یہی مضمون اسلامیہ کالج سول لائنز کے کالج میگزین "فاران" میں مئی ۱۹۶۳ء کے شمارہ:۶ میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک کثیر الجہت ادبی شخصیت ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے مضامین کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ مضامین کلاسیکی وجدید ادب (شاعری ونثر)، تاریخ، عالمی ادب، تجزیاتی مطالعوں اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہاں پر ان مضامین کو شعری، نثری یا افسانوی اور متفرق تنقیدی مضامین کے ذیلی عنوانات کے تحت موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے مضامین میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کی تصنیفات میں شامل ہیں۔ موضوع مقالہ کی مناسبت سے یہاں پر ان مضامین کی فہرست دی جارہی ہے، جو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تصنیفات میں شامل ہیں۔ یہ مضامین غیر مدون سرمایے میں شمار نہیں کیے جاسکتے لہٰذا ان مضامین کو مقالہ میں موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا:

۱۔ " مجید امجد-آشوبِ زیست اور مقامی وجود کا تجربہ "(ماہ نامہ "اوراق"(جدید نظم نمبر)، لاہور، شمارہ:۷/۸، جولائی، اگست ۱۹۷۷ء) مشمولہ: نئے شعری تجزیے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۲۔ "حالی اور تاریخ کا مادی شعور" (سہ ماہی "ثقافت" اپریل ۱۹۷۷ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۳۔ "بے معنویت سے معنویت کی طرف ایک طویل سفر" (رشید امجد، فاروق علی، مرتبین، پاکستانی ادب (پہلی جلد)، راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، مئی ۱۹۸۱ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، بہ عنوان: "حالی اور تاریخ کا مادی شعور"، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۴۔ "حالی اور تاریخ کا عصری شعور" (شش ماہی "مخزن" قائدِ اعظم لائبریری، لاہور، شماہ:۲۰۱۵،۱ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، بہ عنوان: "حالی اور تاریخ کا عصری شعور"، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۵۔ "راشد اور نیا آدمی" (ماہ نامہ "اوراق" لاہور، شمارہ:۱/۲، جنوری، فروری ۱۹۷۶ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۶۔ "نئی شاعری نیا میتھڈ" (افتخار جالب، مرتبہ، نئی شاعری (ایک تنقیدی مطالعہ)، لاہور: نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، بعنوان: "نئی شاعری کا میتھڈ"، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۷۔ "نئی شاعری سے نئی نئی شاعری تک" (ماہنامہ "ماہِ نو" لاہور، شمارہ:۲، مئی ۱۹۷۷ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، بعنوان: "نئی شاعری-ماضی وحال"، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۸۔ "انجمن پنجاب کی شعری تحریک سیاسی، سماجی اور تہذیبی پسِ منظر" (ماہ نامہ "ماہِ نو" (چالیس سالہ مخزن)، لاہور، جلد:۱، جنوری ۱۹۷۸ء)، مشمولہ: نئے شعری تجزیے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء، نیز "نظمِ آزاد" لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء، مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مقدمہ کا ابتدائی حصہ بھی اسی مضمون پر مشتمل ہے۔

۹۔ "فسانۂ آزاد کی پرانی دنیا" (ماہ نامہ "اوراق" (خاص نمبر)، لاہور، شمارہ:۱/۲، جنوری، فروری ۱۹۷۸ء)، مشمولہ: فسانۂ آزاد ایک تنقیدی جائزہ، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء

۱۰۔ "آبِ حیات ہزار سالہ تہذیبی ثقافت" (سہ ماہی"صحیفہ"(محمد حسین آزاد نمبر)، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ:۱۹۷/۱۹۵، اکتوبر ۲۰۰۸ء تا جون ۲۰۰۹ء)، مشمولہ: آبِ حیات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء، یہ مضمون "آبِ حیات" مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مقدمہ پر مشتمل ہے۔

۱۱۔ "شاگردانِ مصحفی" کتابی شکل میں شائع شدہ بعنوان: شاگردانِ مصحفی از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء

۱۲۔ "فکر اقبال کا دورِ اول ثقافتی تجزیہ" ("خیابان"(دانائے راز نمبر)، پشاور یونیورسٹی، پشاور، شمارہ:۹، اکتوبر ۱۹۷۷ء)، مشمولہ: اقبال اور نئی قومی ثقافت، بعنوان: قومیت کے ابتدائی تصورات، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء

۱۳۔ "اقبال اور نئی قومی ثقافت" (ماہ نامہ "ماہِ نو" لاہور، اگست ۱۹۷۷ء)، مشمولہ: اقبال اور نئی قومی ثقافت، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء

۱۴۔ "مطالعۂ احوال"، مشمولہ: ادبی تحقیق کے اصول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء

(الف) شعری تنقید

کلاسیکی ادب میں میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ اور ظفرؔ کے نام شعری حوالے سے اہمیت رکھتے ہیں۔ میر کی تصنیفات میں اردو کے چھ دیوان، ایک تذکرہ "نکات الشعراء" اور آپ بیتی "ذکرِ میر" اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "میر کی ابتدائی زندگی کے دانش مند بوڑھے" (ماہ نامہ "علامت" لاہور، شمارہ:۵، فروری ۱۹۹۹ء) میر کی شاعری کو اس کی بچپن کی زندگی کے پیشِ نظر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ جس پر توجہ نہیں کی گئی۔ مضمون میں "ذکرِ میر" سے مختلف واقعات جو بچپن میں میر کی مختلف بزرگوں سے ہونے والی ملاقاتوں پر مبنی ہیں درج کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات میر کی ذہنی تشکیل میں اہمیت کے حامل ہیں:

> "میر کا باپ علی متقی اور احسان اللہ بایزید ایسے درویش کردار تھے جن سے میر کی ابتدائی زندگی بے حد متاثر ہوئی۔ باپ سمیت ان تمام کرداروں کی شکستگی، شکستہ دلی، عشق، جنون، وحشت سخت کوشی، بادیہ پیمائی، دشت گردی، عالمِ حیرت، استغراق، ترک دنیا، گوشہ نشینی، سوختہ خیالی، گریہ شبی اور مستی کی کیفیات نے میر پر نہایت دور رس اثرات مرتب کیے۔"۱

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مضمون میں ان بزرگوں کی جلد وفات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جس کا میر کی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔ یہ اثر ان کے اشعار میں بھی نظر آتا ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بڑا کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

مضمون میں میر کی ان بزرگوں سے ملاقات کا احوال ملتا ہے۔ ساتھ ہی اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ ان ملاقاتوں اور ان بزرگوں کی جلد موت کا میر کی زندگی پر گہرا اثر ہوا اور یقیناً ایسا ہی ہے کیوں کہ زندگی کے اندوہناک واقعات انسان کے لاشعور پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں۔ اس کی باطنی زندگی پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ لیکن کلامِ میر سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے عملی طور پر مثالیں پیش نہیں کی کہ ان واقعات اور ملاقاتوں کے اثرات میر کے ہاں کس صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ مضمون ناقدینِ میر کے لیے میر کو سمجھنے کی نئی راہیں ضرور متعین کرتا ہے۔

غلام ہمدانی مصحفی کا شمار اردو کے اہم کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں اردو کے گیارہ دیوان شامل ہیں۔ ان میں آٹھ دیوان غزلیات و دیگر اصناف جب کہ تین دیوان قصائد کے ہیں۔ فارسی شعرا کا تذکرہ "عقدِ ثریا" اور اردو شعراء کے تذکرے "تذکرہ ہندی" اور "ریاض الفصحا" کے علاوہ عربی و فارسی رسائل کا مجموعہ "مجمع الفوائد" بھی مصحفی کی یادگار ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "مصحفی: شخصیت اور فن" کے عنوان سے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھا اور ۱۹۷۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن اس سے پہلے ان کا مضمون "دیوان قصائدِ مصحفی" (ماہ نامہ "صحیفہ" لاہور، شمارہ: ۵۰، جنوری ۱۹۷۰ء) شائع ہو چکا تھا یہ مضمون تحقیقی ہے۔ جس میں نسخۂ لاہور کا تعارف کرایا گیا ہے اور نسخہ میں شامل قصائد کی صحیح تعداد کا تعین کیا گیا ہے۔

رسالہ "نقوش" کے ادبی معرکے نمبر میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے شائع ہونے والے دو مضامین "مصحفی اور انشاء کا معرکہ" اور "مصحفی اور سودا کا معرکہ" (ماہ نامہ "نقوش" (ادبی معرکے نمبر)، لاہور، جلد: ۲، شمارہ: ۱۲۷، ستمبر ۱۹۸۱ء) خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مصحفی اور سودا کے معرکہ کے حوالے سے انہوں نے امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کے حوالے دیتے ہوئے اور ہجو مصحفی سے مختلف اشعار درج کرتے ہوئے اس تاثر کی نفی کی ہے کہ کبھی مصحفی اور سودا کی درمیان کوئی معرکہ ہوا تھا۔ انہوں نے مروجہ کلیات میں شامل ہجو سے مختلف اشعار کے حوالے دیتے ہوئے اس سے انکار کیا ہے کہ یہ ہجو سودا کی تحریر کردہ ہے۔

"مصحفی اور انشاء کا معرکہ" (ماہ نامہ "نقوش" (ادبی معرکے نمبر)، لاہور، جلد: ۲، شمارہ: ۱۲۷، ستمبر ۱۹۸۱ء) میں انہوں نے تنازعہ کے اسباب، زمانہ اور اس دوران لکھی جانے والی نظموں کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "انشاء بے حد شوخ و سنگ اور طباع انسان تھے نفسیاتی طور پر ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ہر مدِ مقابل کو فوراً نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے... مصحفی اور انشاء کے معارضہ میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مصحفی نے سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہونے کے بعد کچھ مقام پیدا کر لیا ہو اور وہ شہزادے کے قریب ہو گئے ہوں اور یہ بات انشاء کی نفسیاتی کمزوری تھی۔ یہیں سے انشاء نے مصحفی کے خلاف نفسیاتی محاذ پر جنگ شروع کی اور انہوں نے سلیمان شکوہ کو مصحفی سے بد ظن کیا۔"۲

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "مصحفی بحیثیت نقاد اور تذکرہ نگار" ان کے پی۔ ایچ۔ڈی کے مقالے کا ایک باب ہے۔ یہ مضمون کی صورت میں ۱۹۸۳ء (سہ ماہی "مجلہ تحقیق" یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، شمارہ: ۴، ۳، ۲، ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے مصحفی کی شاعری، تذکروں میں مختلف شعراء پر دی گئی رائے سے مصحفی کے تنقیدی رجحانات جاننے کی سعی کی ہے۔ مصحفی کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> "مصحفی کا تعلق بیک وقت دبستانِ دلی اور دبستان لکھنؤ سے تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں... دبستانِ دلی کا نمائندہ ہونے کے سبب مصحفی سادگیٔ شعر پسند کرتے ہیں مبالغہ کو اچھا نہیں سمجھتے اور دبستانِ لکھنؤ کے زیرِ اثر شعر کی خارجی ہیئت کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔"۳

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مصحفی کی عملی تنقید کے چند نمونے ان کے شعراء پر لکھے ہوئے تذکروں سے پیش کیے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مصحفی کے ہاں واضح تنقیدی آراء اور شعراء کے کلام کا تجزیہ و تشریح نہیں ملتی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مصحفی پر لکھے ہوئے مضامین میں تحقیقی عنصر غالب ہے۔ اس کی واضح مثالیں "دیوان قصائد مصحفی"، "مصحفی و سودا کا معرکہ" اور "مصحفی و انشاء کا معرکہ" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جہاں انہوں نے دلائل دیتے ہوئے مصحفی کے قصائد کی تعداد، مصحفی و سودا کے معرکہ کی نفی اور مصحفی و انشاء کے معرکے کے اسباب اور زمانے کا تعین کیا ہے۔ جب کہ "مصحفی بحیثیت نقاد اور تذکرہ نگار" میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی بھی ملتی ہے۔ انہوں نے مضمون میں مصحفی کے تذکروں کی ادبی لحاظ سے قدر و قیمت کا تعین کیا

ہے۔ ان تذکروں کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ ان سے نہ صرف مصحفی کے ہم عصر شعراء کے متعلق اہم معلومات ملتی ہیں بلکہ اس دور کی مروجہ تنقیدی اصطلاحات سے واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے۔

ان مضامین کا مطالعہ ادبی حقائق سے واقفیت، مصحفی کے نظریۂ شعر اور کلامِ مصحفی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مصحفی کا دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے دوراہے پر کھڑے ہونا دراصل ان دونوں دبستانوں کے امتزاج سے وجود میں آنے والی شاعری کی طرف اشارہ ہے۔ جو ادب کے عام قاری کو کلامِ مصحفی کی تفہیم میں مدد دیتا ہے۔

غالب اردو ادب کی ایک مرکزی شخصیت کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے والد عبداللہ بیگ، راجہ بختاور سنگھ کی فوج میں کماندار تھے۔ غالب کی عمر ابھی پانچ برس ہی تھی کہ ان کے والد ایک جنگی معرکے میں مارے گئے۔ لہٰذا غالب کا گزر بسر پنشن پر ہوتا تھا لیکن شاہانہ خرچ نے انہیں مقروض بنا دیا تھا۔ اس پر افتاد یہ کہ غالب کے عہد نے ان کی قدر نہ کی اور وہ اجنبیت کا شکار رہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "غالب کی مغائرت۔ تفہیمِ غالب کا ایک دور" (سہ ماہی "صحیفہ" لاہور، شمارہ:۱۸۵، اپریل، جون ۲۰۰۶ء) ان کی مالی پریشانیوں اور زمانے کے ناروا سلوک سے ان کے تخلیقی عمل میں ہونے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ مضمون میں غالب کے سفر کلکتہ، قیامِ کلکتہ کے دوران افضل بیگ خان کی وجہ سے پیش آنے والی رکاوٹوں اور دلی کے ادبی منظر نامہ غالب کی ذہنی اپج سے مناسبت نہ رکھتا تھا کا ذکر کرتے ہوئے غالب کے تخلیقی عمل میں ہونے والی تبدیلی کی وجوہات کا ذکر کیا گیا ہے:

> "کلکتہ مشن کی ناکامی شدید مالی بحران کے تسلسل اور اردو شاعری میں ان کے مقام کو تسلیم نہ کیے جانے کے احساس نے انہیں زندگی کا ایک بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا فیصلہ تھا کہ اب وہ صرف فارسی شاعری کریں گے۔ انہوں نے اردو شاعری کو خیر باد کہہ دیا۔ دراصل یہ بہت بڑا احتجاج تھا جسے ان کا دور نہ سمجھ سکا۔"[۴]

"غالب کی مغائرت۔ تفہیم غالب کا ایک دور" غالب کی زندگی کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ جو ان کی تخلیقی زندگی پر شدت سے اثر انداز ہوا۔ اس دور میں ذوق وہی کچھ کہہ رہا تھا جو لوگ سننا چاہتے تھے لیکن غالب کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ غالب کی فلسفیانہ باتیں لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ لہٰذا غالب اجنبیت کا شکار رہا۔

یہ مضمون غالب کی شاعری قیامِ کلکتہ کے دوران اور پھر بعد کی فارسی شاعری کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ قیامِ کلکتہ کے دوران غالب نے جو ترقی دیکھی اس کے اثرات "آئینِ اکبری" پر لکھی گئی تقریظ میں بھی نظر آتے ہیں۔ موجودہ دور میں نفسیاتی تنقید کا دبستان خاصی اہمیت اختیا کر گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ مضمون غالب کی تحلیلِ نفسی میں غیر معمولی حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ غالب کی زندگی کے اس اہم دور کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جس کے بارے میں بہت کم یا بالکل سرسری لکھا گیا ہے۔

مغلوں نے برِ صغیر پر ساڑھے تین سو سال حکومت کی جس میں آخری سو سال علامتی حکومت کے بھی شامل ہیں۔ ان مغل حکمرانوں میں آخری فرماں روا بہادر شاہ ظفر شعر و ادب کا دلدادہ اور خود بھی شاعر تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "بہادر شاہ ظفر..." "قفس" و "زنداں" کی علامتوں میں" (ماہ نامہ "علامت" لاہور، شمارہ:۶، مارچ ۲۰۰۰ء) بہادر شاہ ظفر کی داخلی و خارجی زندگی کا عکاس ہے۔ ظفر نے علامتی بادشاہ کی حیثیت ایک عرصہ حکومت کی اور زندگی کے آخری ایام قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے۔ جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی نظر آتا ہے۔

ظفر کے ہاں قید، قفس، زنداں، اسیر، صیاد جیسی علامتوں کا بکثرت استعمال ملتا ہے۔ اس کی وجہ فرنگیوں کا غلبہ اور نام نہاد بادشاہت تھی جس میں بہادر شاہ ظفر کو اتنی آزادی تک نہ تھی کہ وہ اپنے قلعے سے باہر جا سکے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بہادر شاہ ظفر کا مطالعہ اسی پسِ منظر میں کیا ہے۔ انہوں نے کلامِ ظفر سے مثالیں دیتے ہوئے ان کے ہاں قفس و زنداں جیسی علامتوں کی تفہیم برِ صغیر کے سیاسی پسِ منظر میں کی ہے:

"برِ صغیر کی سیاسی صورت حال کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برِ صغیر میں ظفر تک پہنچتے پہنچتے عملی توانائی اور فعالیت کی تمام منابع سوکھ چکے تھے۔ لہٰذا ظفر جیسا شاعر حال کی بے ثمری اور لاحاصلی کی اذیت میں سفر کرنے پر مجبور ہے۔"۵

بہادر شاہ ظفر کے ہاں علامتوں کا سیاسی پسِ منظر میں مطالعہ جہاں برِ صغیر کی سیاسی صورت حال سے آگاہی کا سبب بنتا ہے وہیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی سیاسی بصیرت افروزی بھی ظاہر کرتا ہے۔ قفس، زنداں، اسیر، زنجیر جیسی علامتیں جو فیض کے ہاں ملتی ہیں وہ دراصل ظفر کی روایت کا حصہ ہیں۔

بہادر شاہ ظفر پر لکھا گیا مضمون جہاں ان کی شاعری کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے وہیں مغلیہ حکومت کے زوال کی داستان بھی بیان کرتا ہے۔ یہ زوال سیاسی و معاشی ہے جس نے ظفر کی انا کو بارہا گھائل کیا اور اس نے شاعری میں گوشۂ عافیت ڈھونڈنے کی سعی کی۔ جو مختلف علامات کا روپ دھار کر ان کی شاعری میں نمودار ہوتی ہے۔

ناقدینِ ادب قفس و زنداں کی علامتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو محض فیض تک محدود رکھتے ہیں۔ حالاں کہ ابتدائی طور پر ان علامتوں کا سیاسی استعمال ظفر کے ہاں ملتا ہے۔ یہ مضمون جہاں ادب کے قاری کو ان علامتوں کو وسیع معنوں میں سمجھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہیں آئندہ کے ناقدین کے لیے بھی ایک نئی جہت متعین کرتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی، غالب کے شاگرد اور سر سید کے دست راست تھے۔ انہوں نے سوانح نگار کی حیثیت سے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ ان کے فن کا ایک روشن پہلو شاعری بھی ہے وہ شعر و ادب کے جدید تصورات رکھتے تھے یہ تصورات ان کی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" میں ملتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "حالی اور نیا طرزِ احساس" (پندرہ روزہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ:۱، جنوری ۱۹۸۰ء) حالی کی شاعری کے پسِ منظر، محرکات، ان کے نظریۂ قومیت اور انسان دوستی یعنی انسانیت کے جذبات سے بحث کرتا ہے۔ انہوں نے حالی کی شاعری کے محرکات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

"حالی کی شاعری ٹھوس معروضی حالات سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ اس قومی المیے سے پیدا ہوتی ہے جو برِ صغیر میں قومی زوال سے پیدا ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کا ہمہ گیر زوال شروع ہوا جس کی زد میں مسلمانوں کے تمام طبقات آگئے۔ ان کی تخلیقی زندگی اس زوال سے شدید طور پر متاثر ہوئی۔"۶

ٹھوس معروضی حالات سے پیدا ہونے والی شاعری "مسدسِ حالی" کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ مضمون میں حالی کے تصورِ قومیت کو ان کے اقتباس سے واضح کیا گیا ہے، جس میں حالی اجتماعیت اور اجتماعی ترقی کے قائل ہیں۔ حالی کے تخلیقی عمل میں بھی انسانی ہمدردی اور انسان دوستی ملتی ہے۔ جو اپنے عہد کے سامراجی جبر، ناانصافی اور غیر انسانی رویوں سے جنم لیتی ہے۔

"حالی اور نیا طرزِ احساس" جہاں حالی کے تخلیقی عمل اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالتا ہے وہیں جبر و ناانصافی اور سامراجیت کے دور میں تخلیق ہونے والے ادب اور بدلتے ہوئے موضوعات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس کی واضح مثالیں حالی کے ہاں ملتی ہیں۔

اس مضمون میں یہ خامی ہے کہ اس میں موجود اقتباس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ لیکن اس سے قطع نظر مجموعی طور پر یہ مضمون عہدِ حالی کے متعلق قاری کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ جس میں مسلمان تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے تنزلی کا شکار تھے۔

اس مضمون کا مطالعہ سیاسی و معاشی بدحالی سے جنم لینے والے رویوں اور ادبی رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ کیسے معاشرتی عوامل ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

رئیس المتغزلین حسرت موہانی اپنے دور کے نامور شاعر اور سیاسی راہنما تھے۔ مصحفی جس کے ہاں دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلی کا امتزاج ملتا ہے حسرت کے ہاں مصحفی کا رنگ غالب ہے۔ حسرت کا تعلق جس عہد سے ہے اس میں روایتی سانچے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے اور ان کی جگہ نیا رنگ غالب آ رہا تھا لیکن حسرت نے روایت ہی کو اپنا شعار بنایا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "حسرت۔ماضی اور حال" (ماہ نامہ "نگار"(حسرت موہانی نمبر)، کراچی، شمارہ:۴/۶، اپریل، جون۱۹۷۶ء) حسرت کی ثقافتی ورثے کی پاس داری اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے۔ حسرت کے ہاں اجتماعی لاشعوری تجربات کا بیان ملتا ہے جو روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حسرت کثیر الجہت شخصیت کے حامل تھے اور یہی وہ جہتیں ہیں جنہوں نے حسرت کو امتیا بخشا:

> "حسرت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر حسرت کے ساتھ تین اور حسرت کام کر رہے تھے۔ صوفی حسرت، سیاسی رہنما حسرت اور انقلابی حسرت، شاعر حسرت کا قد ان تین باقی حسرتوں نے مزید اونچا کیا۔ حسرت گویا چار حسرتوں کا مجموعہ تھے...اب چاروں حسرت کتابوں میں ہیں اور چار مختلف اکائیوں میں ہیں۔"۷

حسرت کا چار مختلف اکائیوں میں تقسیم ہونا ہی انہیں اپنے عہد تک محدود کرتا ہے۔ مضمون میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دراصل حسرت ان چاروں اکائیوں کے امتزاج سے کوئی بڑا تخلیقی تجربہ نہ کر سکے تھے جس نے ان کی شعری نمو کو نقصان پہنچایا۔ وہ اپنے دور میں تو خاصے مقبول ہوئے لیکن بعد کی نسل نے انہیں قبول نہ کیا۔

"حسرت۔ماضی اور حال" عہدِ حسرت، حسرت کی شخصی جہات اور حسرت کے مخصوص ثقافتی رنگ کا احاطہ کرتا ہے۔ نیز یہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو چیز ایک شاعر کو بڑا شاعر بناتی ہے یعنی تخلیقی تجربہ، جدید رجحانات کی پاس داری، امتزاجی رنگ جو کسی فن پارے میں یک جا ہو کر قاری کو ایک وژن دیتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا فقدان حسرت کے ہاں ملتا ہے۔ جس نے حسرت کو اپنے عہد تک محدود کر دیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ مضمون جہاں حسرت کی تفہیم، ان کی مقبولیت و غیر مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے وہیں قاری کو تخلیقی تجربے سے جنم لینے والی بڑی شاعری کے متعلق بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ جو قاری کو اہم اور غیر اہم میں فرق بتاتی ہے۔

جدید اردو شاعری ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا محبوب موضوع ہے۔ جدید شعراء میں خصوصاً میراجی اور راشد پر انہوں نے قابل قدر کام کیا ہے۔ میراجی جدید نظم کے اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے مغربی شعراء کے تراجم اور نئے تجربات کیے۔ بعد میں انہی تجربات پر جدید شاعری کا محل تعمیر کیا گیا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "میراجی کی شاعری کا آخری دور" (ماہ نامہ "ماہِ نو" لاہور، شمار:۵، مئی ۱۹۸۱ء) کے عنوان سے مضمون لکھا۔ جس میں انہوں نے میراجی کے نقادوں کو نشانہ بنایا ہے کہ انہوں نے میراجی کی شاعری کی ایک ہی جہت یعنی جنسی شاعری کو موضوع بنایا ہے جس نے میراجی کی شاعری کو محدود کر دیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میراجی کے آخری شعری مجموعہ "تین رنگ" کو موضوع بحث بناتے ہوئے ان کی مختلف شعری جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ مختلف نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے میراجی کی شاعری میں اصول حرکت، زندگی کے جمود اور حرکت و حرارت کا تجربہ، بقا کا تصور جیسی خوبیوں کی نشاندہی کی ہے۔ "تین رنگ" متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں:

> "اس مجموعے سے وہ نیا شعری تناظر ظاہر ہوتا ہے جو میراجی کے تخلیقی تجربے میں آ چکا تھا۔ میراجی کا یہ نیا شعری تناظر ان کے نئے امکانات کا شاہد ہے۔ جن سے میراجی کی شاعری ترتیب پا رہی تھی اور نئے امکانات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میراجی فکری اعتبار سے اپنی شاعری کے نئے افق سے طلوع ہو رہے تھے۔"۸

میر اجی کی شاعری کے نئے افق کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کی شاعری میں آرکی ٹائپل پیٹرن کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے میر اجی کی نظموں میں "ارتقا"، "یگانگت" اور "منظر" میں بالترتیب زندگی کی بنیادی حقیقت موت، زمانۂ وقت کے تسلسل اور زندگی کی آفاقی آرکی ٹائپ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کہنا ہے:

> "میر اجی کی نظموں میں پائے جانے والے یہ آرکی ٹائپل پیٹرن ان کی شاعری کے افق پر بننے والے نئے منظر نامے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میر اجی کے بے رحم نقادوں نے ان کی جو یک رُخی تصویر پینٹ کی ہے یہ تصورات اس کی نفی کرتے ہیں۔"۹

"میر اجی کی تلاش میں" میر اجی کی شخصیت اور ان کی ذات سے متعلق اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ مضمون کا ایک حصہ "میر اجی کی شاعری کا آخری دور" سے نقل کیا گیا ہے لیکن میر اجی کی زندگی سے مختلف واقعات درج کرنے سے اس مضمون کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

میر اجی پر لکھے گئے مضامین کا زیادہ رجحان اس یک رُخی تنقید کی طرف ہے، جس نے میر اجی کے فن اور ان کی شخصیت کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ "میر اجی اور جدید نظم کی تفہیم کا فریم ورک" میں ان سانچوں کی طرف توجہ کرائی گئی ہے جو میر اجی نے جدید نظم کو سمجھنے کے لیے وضع کیے تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میر اجی کی تنقید میں وزیر آغا کی تھیوری تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق امتزاجی تنقید سے مراد محض تھیوریوں کی حاصل جمع نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ کچھ زیادہ سے مراد Extra Textual Performance ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک:

> "جدید نظم کے لیے میر اجی نے تفہیم کا جو فریم ورک مرتب کیا تھا اس میں بہت اہم پہلو متن کی ذیلی ادائیگی Extra Textual Performance کا ہے۔ میر اجی نظم کے متن پر گہرا غور و فکر کرتے ہیں۔ ان کو گہری قدرت حاصل تھی کہ وہ متن کے اندر آسانی سے اتر جاتے تھے اور متن کے مطالب ان کے سامنے تیزی سے روشن ہوتے جاتے تھے۔"۱۰

Extra Textual Performance کی تکنیک میر اجی کے ہاں ملتی ہے اس کی واضح مثال یوسف ظفر کی نظم "خیالات پریشان" پر ان کی تنقید ہے۔ دراصل یہ ایک تخلیقی پہلو ہے جو میر اجی نے جدید نظم کی تفہیم کے لیے اپنایا اس سے ان کی تخلیقی تنقید سامنے آتی ہے۔ نظم کو سمجھنے کے لیے انہوں نے نظم کی Reconstructuring کی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میر اجی پر لکھے گئے مضامین ایک طرف تو میر اجی کے نقادوں کے یک رخے رویے کی طرف اشارہ کرتے ہیں دوسری طرف میر اجی کے کلام کی کثیر الجہتی اور جدید نظم کو سمجھنے کا جو سانچہ میر اجی نے بنایا تھا اسے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ میر اجی کے دیگر نقادوں کی نسبت ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میر اجی کو نئی معنویت دی ہے جو ادب کے قاری کو ایک وژن دیتی ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کے سکیڑنے کے بجائے وسعت عطا کرتی ہے۔

ن۔م راشد کا شمار جدید اردو شاعری کے اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے روایتی شاعری سے فنی اور معنوی انحراف کیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی راشد پر تنقیدی کتاب "لا=راشد" تفہیمِ راشد میں اہم پیش رفت ہے۔ جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی۔ لیکن تفہیمِ راشد کا یہ سلسلہ رکتا نہیں اس کے بعد بھی ان کے راشد پر مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے راشد صدی کے موقع پر مضمون "راشد صدی: مسائل و افکار" (شش ماہی "بازیافت" شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ:۱۸ جنوری، جون ۲۰۱۱ء) لکھا اور گزشتہ صدی میں راشد پر ہونے والے تحقیقی و تنقیدی کام کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے نزدیک راشد کی میت سوزی کی خواہش کے پیشِ نظر راشد

دشمنی، راشد سے عداوت کا ایک سلسلہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جابر علی سید کے مقالہ "راشد اور اقبال" کی مثال پیش کی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نزدیک:

> "مسئلہ یہ ہے کہ راشد کی نہایت معنی خیز شاعری کی تفہیم کے لیے شعری عرفان اور سماجی بصیرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ راشد جیسے شاعر کی غواصی کوئی ماہرِ غواص ہی کر سکتا ہے۔ کوئی عام غواص یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا شخص یا تو بالائی سطح پر تیرتا رہے گا ورنہ ڈوب جائے گا۔"۱۱

راشد کے ہاں تخاطب، خود کلامی اور مکالمے کی تکنیک کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون معنی خیز ہے۔ انہوں نے راشد کے کلام سے مثالیں دے کر خصوصاً "حسن کوزہ گر" کو بنیاد بناتے ہوئے تخاطب کی تکنیک کو واضح کیا ہے جو کہ اظہارِ ذات کا ذریعہ ہے:

> "حسن کوزہ گر راشد کی شاہ کار نظم ہے۔ جس میں ساری واردات کا اظہار اول سے آخر تک تخاطب کی مسلسل شکلوں اور کہیں کہیں خود کلامی کی شکل میں ملتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "حسن کوزہ گر" کی تکنیک کا انحصار تخاطب پر ہے۔"۱۲

مضمون "تنقیدِ راشد" (سہ ماہی "معیار" انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ:۶ جولائی، دسمبر ۲۰۱۱ء) میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے راشد پر ہونے والی تنقید کو موضوع بنایا ہے۔ یہ مضمون دراصل "راشد صدی: مسائل و افکار" ہی کا پیش خیمہ ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے راشد پر تنقید کرنے والے نقادوں کے محدود وژن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے راشد کے وسیع معنوں میں دیکھا ہے۔ کیوں کہ راشد لسانی اور جغرافیائی حدود سے ماوراعالمی سطح کے شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ یا تفہیم کے لیے نقاد کا وسیع النظر ہونا ضروری ہے۔ یہ وسیع النظری ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے تنقیدی شعور کا خاصا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ناقدین راشد میں پروفیسر فتح محمد ملک کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی کتاب "راشد: سیاست اور شاعری" راشد کی شاعری کے اہم پہلو ہم عصر سیاست کے کلام راشد پر اثرات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "فتح محمد ملک نے راشد کی شاعری کی جو تعبیر کی ہے وہ ہماری مروجہ تنقید راشد سے بالکل مختلف ہے... ان کے اس زاویہ نظر سے تنقید راشد کا ایک بالکل نیا زاویہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے پاکستان اور عالمِ اسلام کے حوالے سے راشد کی شاعری میں جو معنوی شناخت دریافت کی ہے وہ بہت توجہ طلب ہے۔ اس کتاب نے راشد کو مروجہ تنقید سے بلند ہو کر فکری، نظریاتی اور روحانی جہات میں تلاش کیا ہے اور یوں راشد ایک مختلف شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔۱۳

راشد کے شعری مجموعہ "ایران میں اجنبی" میں داستانی نظمیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان نظموں کے پسِ منظر کو ہندوستان میں کلونیل ازم کی تباہ کاریوں اور ایران میں کلونیل اثرات سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے راشد کی نظموں "تیل کے سوداگر"، "وزیرِ چنیں" اور "ساویراں" میں داستانی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔

"لا=راشد" میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کلامِ راشد کی تفہیم اور خصوصاً ان کے ہاں پائی جانے والی علامتوں کی تفہیم میں تہذیب و ثقافت کی طرف سفر کیا ہے۔ لیکن "لا=راشد" کے بعد شائع ہونے والے مضامین میں انہوں نے زیادہ بحث تنقید راشد کے حوالے سے کی ہے۔ جس کی بازگشت "لا=راشد" میں شامل مضمون "تنقیدِ راشد کے پچاس سال" میں بھی سنائی دیتی ہے۔ لیکن یہاں پر انہوں نے راشد کو نئی معنوی تفہیم اور راشد کے حوالے سے مختلف نقادوں کی یک رخی تنقید اور چبائے ہوئے موضوعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

راشد پر لکھے گئے مضامین جدید نظم کے قاری کو راشد کے حوالے سے مختلف نقادوں کے مخصوص تنقیدی رویے سے واقفیت اور ایک نیا وژن عطا کرتے ہیں۔ جس سے تفہیم راشد کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال "راشد کی شاعری میں داستانی عناصر (ایران میں اجنبی کے حوالے سے)" (سہ ماہی "معیار" انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ:۷، جنوری، جون ۲۰۱۲ء) کی صورت میں ملتی ہے۔ جو راشد کے نقادوں کو ایک نئی راہ، تفہیم راشد کے ایک نئے زاویے اور ادب کے قاری کو ایک نئی معنوی تفہیم عطا کرتی ہے۔ جس طرح راشد نے روایتی شاعری سے فنی اور معنوی انحراف کیا تھا اسی طرح ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے راشد پر لکھے ہوئے مضامین بھی تنقیدِ راشد کے روایتی پیرائے سے انحراف اور اسے وسعت عطا کرتے ہیں۔

میراجی اور راشد نے جس شعری روایت کی بنیاد رکھی تھی مجید امجد بھی اسی روایت کے اہم شاعر ہیں۔ مجید امجد پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "مجید امجد: شاعری کے آخری دور کی معنویت" (شش ماہی "بازیافت" شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ: ۲۴ جنوری تا جون ۲۰۱۴ء) ان کے آخری دورِ شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جو انہیں جدید شاعری میں ایک خاص مقام دلاتا ہے۔ جب کہ نقاد اس دور کی شاعری سے دامن بچاتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ جدید شاعری میں الفاظ کو نئی معنویت، نئے قرینے سے استعمال کیا گیا ہے۔ مجید امجد کے ہاں بھی آخری دور کی شاعری میں الفاظ کو نئے معنوی پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس دور کی شاعری کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مجید امجد کی نظم "بے ربط" اور "وہ بھی کیا نام ہے" کی مثالیں دی ہیں۔ ان نظموں میں الفاظ کو نئے مفاہیم میں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مجید امجد کے دورِ آخر کی شاعری کے بدلتے ہوئے منظر نامہ کی نشاندہی کی ہے:

> "ان نظموں کی حیثیت ایک ایسے جزیرے کی سی ہے جسے دریافت نہیں کیا گیا۔ توقع ہے کہ کوئی ادبی مہم جو اس جزیرے کے اندر ضرور داخل ہو گا۔ اس مسئلے کا یہ رخ بھی دیکھتے چلیے کہ مجید امجد کے بیشتر نقاد اس کی شاعری کے پرانے دور ہی میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے مجید امجد پر تنقید لکھتے وقت وہ تقریباً تمام تر مثالیں اس پرانے دور ہی سے دیتے ہیں۔"۱۴

یہاں پر پرانے دور سے مراد مجید امجد کی شاعری کا ابتدائی اور وسطی دور ہے۔ جس میں ان کی شاعری آخری دور کی نسبت سہل اور روایت کی پیروی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مضمون میں مجید امجد کے ہاں اسلوب، قرینے کی نئی تکنیک، مشاہدے اور محسوسات سے بننے والے نئے مناظر، بول چال کے انداز کی بحر اور ہئیت کے نئے تجربات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شاعری کی برتری سے متعلق ان کا کہنا ہے کہ صرف ہئیت کے نئے تجربات شاعری کو برتر نہیں بناتے بلکہ اس کے ساتھ احساساتی اور جذباتی سطح سے بننے والا منظر اسے برتری عطا کرتا ہے۔

"مجید امجد: شاعری کے آخری دور کی معنویت" ان کی دورِ آخر کی شاعری سے تعلق رکھنے والا یہ مضمون جہاں قاری کو ان کی شاعری کی نئی دنیا سے متعارف کراتا ہے وہیں مجید امجد کے ناقدین کے لیے دورِ آخر کی شاعری پر مختلف پہلو سے تنقید کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔

(ب) افسانوی تنقید:

ڈراما ایک اہم صنف ہے جس کا تعلق یونان سے ہے۔ اردو میں ڈراما کی روایت اتنی پرانی نہیں جتنی کہ ہندی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کا تہذیبی رشتہ عربی اور فارسی سے زیادہ گہرا ہے۔ ان میں ڈراما کی روایت موجود نہیں تھی اور نہ ہی ہندی ڈراما کی روایت نے اردو کو متاثر کیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں اردو میں ڈراما نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ اردو میں پہلا ڈراما "اندر سبھا" ملتا ہے جسے امانت لکھنوی نے ۱۸۵۳ء میں لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ڈراما یا تھیٹر کمپنیوں کی روایت بھی زیادہ مستحکم نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ڈراما کمپنیوں سے متعلقہ مضامین انیسویں صدی کے ربع آخر میں لاہور میں کام کرنے والی تھیٹر کمپنیوں اور لاہور کے عوام کے ذوقِ ڈراما بینی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان مضامین میں پنجاب اور خصوصاً لاہور میں ڈراما کمپنیوں کی آمد اور عوامی دل چسپی سے متعلق معلومات اس دور کے اخبارات: "پاٹے خاں" اور "خیر العوام" کو بنیاد بنا کر فراہم کی گئی ہیں۔ یہ دونوں اخبار لاہور سے نکلتے تھے۔ ان کا مضمون "۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں لاہور میں" (پندرہ روزہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ: ۲، جولائی ۱۹۶۰ء) پنجاب میں ڈرامے کی ابتدا سے متعلق اہم معلومات فراہم کرتا ہے:

> "بمبئی، لکھنؤ اور بنگال کے ڈرامے پر کافی کام ہو چکا ہے لیکن افسوس ہے کہ پنجاب میں ڈرامے کی تاریخ تاحال پردے میں ہے اس ضمن میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں بمبئی کا اردو ڈرامہ پورے عروج پر تھا، پنجاب میں بھی ڈرامہ کافی حد تک کر چکا تھا۔ یہاں کے عوام ڈرامے کے بے حد شائق تھے، اور اردو ڈرامہ بڑی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہمیں ۱۸۸۷ئ کے اخبار "پاٹے خاں لاہور" سے معلوم ہوتی ہے۔"۱۵

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مضمون "۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں لاہور میں" میں ہمیں "پارسی اوریجنل اوپیرا تھیٹر کمپنی" اور "انڈین اورینٹیل اوپیرا تھئیٹیکل کلب" کی لاہور میں جون، جولائی اور اگست ۱۸۸۷ء میں سرگرمیوں سے متعلق تمام تر معلومات اخبار "پاٹے خاں" لاہور سے اقتباسات لے کر میں درج کی گئی ہیں۔

مضمون "۱۸۸۳ء میں پارسی انفنسٹن ڈرامیٹک کلب کی لاہور میں آمد" (پندرہ روزہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ: ۱۴، ۱۳، یکم و ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء) میں بھی لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات "کوہِ نور" اور "خیر العوام" کے فروری اور مارچ ۱۸۸۳ء کے شماروں کو بنیاد بنا کر معلومات درج کی گئی ہیں۔ اس مضمون سے پارسی انفنسٹن ڈرامیٹک کلب کی لاہور میں سرگرمیوں اور لاہور کے عوم کی ڈراما میں دل چسپی ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "اردو ڈرامہ اندر سبھا سے پارسی تھیٹر تک" (ماہ نامہ، "نئی قدریں" حیدر آباد (سندھ)، شمارہ: ۱۹۸۰، ۳، ۲ء) خاص اہمیت کا حامل ہے۔ مضمون کا پہلا حصہ ڈراما "اندر سبھا" کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ "اندر سبھا" کی روایت سے متعلق لکھتے ہیں:

> "اندر سبھا کی روایت میں رقص اور موسیقی پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا اس کی دو وجوہات واضح ہوتی ہیں اول یہ کہ ایک زوال پذیر معاشرے کے لوگوں کی اعصابی تھکن کو سکون دینا دوم اعصابی طور پر لوگوں کو مزید سلانا تاکہ زندگی کے حقائق سے دور فراریت کے اس رستے پر چلتے رہیں۔"۱۶

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مضمون کا دوسرا حصہ پارسی تھیٹر سے شروع کیا ہے۔ جو کہ "اندر سبھا" ہی کی توسیعی شکل ہے۔ اندر سبھا میں موسیقی کا عنصر غالب ہے اور یہی صورت حال پارسی تھیٹر میں ملتی ہے۔ مضمون میں پارسی تھیٹر کی روایت سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگاروں اور ان کے ڈراموں کے متون سے متعلق سید امتیاز علی تاج کی خدمات کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک اچھے ڈراما نگار کے ڈراموں کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرامے کو زندگی کے حقیقی رنگوں کا عکس قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اسی نظریے کے تحت پارسی تھیٹر کا جائزہ لیا ہے۔ پارسی تھیٹر کی روایت سے متعلق لکھتے ہیں:

> "پارسی تھیٹر کی یہ روایت فنی اعتبار سے ناقص ہے۔ جاگیر داری عہد کی رسمی تفریحی روایات نے اس دور کے ڈرامے کو پنپنے نہ دیا۔ ان تفریحی روایات کی وجہ سے اگرچہ اردو تھیٹر کو

زبردست مقبولیت حاصل ہوئی مگر اردو ڈرامہ فنی اعتبار سے پستی کی حالت میں سفر کرتا رہا۔"۱۷

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے ڈراما/ تھیٹر سے متعلقہ مضامین میں تمام تر معلومات اخبارات سے لی گئی ہیں۔ جب کہ اردو "اردو ڈرامہ اندر سبھا سے پارسی تھیٹر تک" میں اندر سبھا اور پارسی تھیٹر کے علاوہ اس دور کے ڈراموں میں غالب رجحانات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مضامین ایک خاص دور میں لاہور میں ڈراما کمپنیوں کی آمد اور سرگرمیوں کے علاوہ تہذیب و ثقافت کے زوال سے اردو ڈراما پر ہونے والے اثرات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

افسانہ مغربی صنف ہے۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کی روایت ایک صدی سے زائد کے عرصہ پر محیط ہے۔ اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم اور منشی پریم چند کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے اردو میں افسانہ نگاری کی بنیاد ڈالی اور اسے ترقی دی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مختلف افسانہ نگاروں اور چند ایک افسانوں پر مضامین لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کاوش زمانۂ طالبِ علمی میں ملتی ہے۔ ان کا مضمون "پریم چند کا فنی شعور" کالج میگزین "فاران" کے دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے پریم چند کے فنِ افسانہ نگاری کا مطالعہ چار مختلف ادوار میں کیا ہے۔ پریم چند کے پہلے دورِ افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں: "پریم چند نے اس دور میں حب الوطنی اور قومی حمیت کے جذبات ابھارنے میں بڑی کوشش کی ہے۔ راجپوتوں کی بہادری کے قصے بیان کر کے بڑھتی ہوئی مغربیت کے مقابلے میں قومی روایات کا پرچم بلند کیا ہے۔"۱۸

پریم چند نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا یہ افراتفری کا دور تھا، برِ صغیر کے عوام نفسیاتی الجھنوں اور احساسِ کمتری کا شکار تھے۔ اس دور میں حب الوطنی اور قومی اور قومی حمیت ابھارنے والے خیالات ہمیں اقبال کے ہاں بھی ملتے ہیں اور یہ صورتِ حال پریم چند کے ہاں ملتی ہے جو کہ وقت کی اہم ضرورت تھی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مختلف ادوار میں پریم چند کے ہاں پائے جانے والے غالب رجحانات مثلاً اصلاحِ معاشرہ اور طبقاتی تقسیم کے خلاف ردِ عمل کی وجوہات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پریم چند کی تحریریں ایک نئے ادبی دور کے آغاز اور نئے موضوعات کی خبر دیتی ہیں۔ پریم چند ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے جو ادب برائے مقصد کے قائل تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے پریم چند کے ہاں فن اور مقصد کا تعلق ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> "پریم چند کا فن، فن اور مقصد کی ایک طویل کشمکش کا اظہار ہے۔ ان کا ہر فن پارہ کسی نہ کسی مقصد کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن یہ مقصد فن پر بہت کم غالب آتا ہے۔ ان کے ہاں فن اور مقصد کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے، بالعموم یہ دونوں پہلو بہ پہلو ہیں، مگر کہیں کہیں مقصد بہت زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور یہ عام طور اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ان کے کردار یا وہ خود لمبی لمبی تقریریں کرنے لگتے ہیں۔"۱۹

اردو افسانہ نگاری میں سعادت حسن منٹو کا نام کرداروں اور موضوعات دونوں حوالوں سے ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ افسانوی ادب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا زیادہ تر تنقیدی سرمایہ منٹو اور اس کے افسانوں ہی سے سے متعلق ہے۔ ان کا مضمون "منٹو کی وجودی اخلاقیات" (ششماہی "تحقیقی زاویے" الخیر یونیورسٹی، بھمبر، کیمپ آفس، اسلام آباد، شمارہ:۱، جنوری، جون ۲۰۱۳ء) منٹو کے کرداروں کو سمجھنے کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے منٹو کے ہاں انسان کی تلاش پر روشنی ڈالی ہے:

> "منٹو کے افسانوں کی بلند جہت انسان کی تلاش ہے اور منٹو نے اپنے افسانوں میں انسان کو دریافت کیا ہے کبھی نہ مرنے والے انسان کو۔ اس نے انسان کو بلند مرتبت لوگوں میں نہیں

ڈھونڈا کہ وہاں انسان کی Dehumanization ہو جاتی ہے اور یہ لوگ انسان رہتے ہی کب ہیں۔ ظاہر میں انسان اور باطن میں کچھ اور۔ مگر منٹو کے گنہ گار لوگوں میں تو ہم Humanizationکا عمل دیکھتے ہیں۔ بدتر اور بدترین لوگوں میں انسان جاگ اٹھتا ہے۔"۲۰

منٹو کی جس افسانوی جہت کی طرف ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اشارہ کیا یہ نہ صرف منٹو کے کرداروں بلکہ منٹو کی شخصیت کو بھی سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ منٹو کے تقریباً سبھی کردار اسی نظریہ کے زیرِ اثر پروان چڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے عملی طور پر منٹو کے افسانوں سے مثالیں پیش کی ہیں۔ وجودی اخلاقیات سے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

"وجودی اخلاقیات میں ہم انسانی سائیکی کی دو جہتوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک جہت کا تعلق اس کی خارجی زندگی سے ہے اور دوسری جہت اس کی داخلی دنیا کی ہے۔ وجودی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خارجی زندگی کی جہت مجروح ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو داخلی جہت اس کو سہارا دے کر تقویت کا سامان فراہم کرتی ہے۔"۲۱

منٹو کے افسانوں پر وجودی اخلاقیات کے نظریہ کی Implement سے ان افسانوں کی نئی اور بہتر تعبیر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس سے منٹو کے کرداروں کی ایک نئی جہت ہمارے سامنے آتی ہے۔

منٹو کے افسانہ "موذیل" پر لکھا گیا مضمون "موذیل" ("تناظر"، ۲۰۱۳ء) میں اس افسانے کی مرکزی کردار موذیل کا مطالعہ مختلف حوالوں سے کیا گیا ہے۔ منٹو نے موذیل کی داخلی زندگی سے انسان کو دریافت کیا ہے اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اسی انسان کی تلاش متن کے زیرِ سطح معنوں کے سفر سے کی ہے۔ انہوں نے چند واقعات کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے بڑی کامیابی سے منٹو کے ہاں پائی جانے والی اخلاقی تھیوری کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ منٹو ہی کا کمال اور وسیع النظری تھی کہ وہ معاشرے کے ایسے طبقات جنہیں پست ترین سمجھا جاتا ہے ان میں بھی اخلاقیات اور بڑائی کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

منٹو کے افسانہ "بو" پر لکھا گیا مضمون "بو" ایک استعارے کی تلاش" ("الحمراء" جنوری ۲۰۱۴ء) گھاٹن لڑکی کے بدن سے نکلنے والی بو کی معنویت بیان کرتا ہے کی کس طرح اس نے رندھیر کو اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ "ٹھنڈا گوشت" کے کردار ایشر سنگھ اور "بو" کے کردار رندھیر کو ایک جیسی صورت حال کا سامنا ہے۔ ان دونوں کا جنسی نظام معطل ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "بابو گوپی ناتھ: قحبہ خانوں کا راہب" ("بنیاد" لمز، لاہور، شمارہ: ۷، ۲۰۱۶ء) میں منٹو کی وجودی اخلاقیات ایک بار پھر سر اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ افسانہ "بابو گوپی ناتھ" میں انسان کی تلاش ملتی ہے اور یہ انسان مرکزی کردار گوپی ناتھ کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

..."منٹو بڑی مدت سے کسی انسان کی تلاش میں تھا۔ بابو گوپی ناتھ اسی انسان کا استعارہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے وہ مدتوں سے تلاش کر رہا تھا.... اردو افسانہ بابو گوپی ناتھ جیسے استعاراتی انسان سے محروم تھا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ نوری ہے نہ ناری وہ تو صرف انسان ہے اور منٹو نے اسی انسان کو دریافت کیا تھا اور یہ انسان صدیوں کے عمل میں بھی زندہ رہے گا۔ تاریخ کے صفحات پر وہ کبھی تحلیل نہ ہونے والا انسان ہے۔"۲۲

منٹو کے افسانوں پر لکھے گئے مضامین حقیقت نگاری، حقیقی زندگی کے کرداروں اور جنسی پہلوؤں سے ہٹ کر ان افسانوں اور افسانوں کے محرکات یعنی کامل انسان کی تلاش جو ہمیں موذیل اور بابو گوپی ناتھ کی صورت میں نظر آتی ہے کی ایک نئی تفہیم، نئی معنویت پیش کرتے ہیں۔ یہ نئی تفہیم نئی معنویت موجودہ دور کی اہم ضرورت ہے کہ جس میں غیر انسانی رویے بڑھتے جا رہے ہیں۔

مرزا حامد بیگ پر لکھے گئے مضمون "افسانے کا نیا افق" (ماہ نامہ "ماہِ نو" لاہور، شمارہ:۹، ستمبر ۱۹۹۳ء) میں ان کے پسِ منظر میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے منٹو، بیدی اور غلام عباس اور انتظار حسین کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ہاں پائے جانے والے اَن ٹولڈ ٹریٹ مَنٹ کی نشاندہی کی ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے قاری کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "اس کا اَن ٹولڈ ٹریٹ مَنٹ یا یوں کہیے کی غیر روایتی طریقِ کار قاری کے لیے صدمات کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ متحیر ہوتا ہے کہ یہ کس آب و ہوا کی کہانیاں ہیں... لہٰذا مرزا حامد بیگ کی کہانیوں کا رخ کرنے کے کی سکت وہی قاری کر سکے گا جو ان نئی کہانیوں کے نئے ٹریٹ منٹ سے روشناس ہو گا اور ذاتی مشقت کے عمل کے لیے مکمل طور پر تیار ہو گا۔"۲۳

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مرزا حامد بیگ کے مختلف افسانوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کہانیوں میں روایت سے انحراف کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح ان کہانیوں کا انجام بھی روایتی کہانیوں سے مختلف ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے روایتی انجام سے انحراف کے ضمن میں مرزا حامد بیگ کے افسانوں "مغل سرائے"، "ایکٹ-یاد گار محفوظ" اور "نیند میں چلنے والا لڑکا" کے اختتامی اقتباسات شامل کیے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا کہنا ہے:

> "یہ اختتامیے زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں، کہ زندگی کے بہاؤ کو پیش کرتے ہیں اور اس بہاؤ کی کوئی منزل نہیں ہے۔ ابد کی طرف بڑھتا ہوا ایک سفر ہے جس پر سارے کردار رواں دواں ہیں اور مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے یہ کردار بھی ابدیت کی منزلوں کے مسافر ہیں اور ان کی واردات نہ ختم ہونے والی ہے۔"۲۴

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا افسانے کے نئے افق کو سمجھنے اور سمجھانے کا انداز روایتی قسم کا نہیں ہے اور نہ ہی وہ افسانے کے نئے افق پر طلوع ہونے والے افسانوں کی طرح قاری کو کسی مشقت میں ڈالتے ہیں۔ انہیں نئے افسانہ کے قاری کی نفسیات سے مکمل واقفیت حاصل ہے۔ لہٰذا وہ نئے افسانہ کے قاری کی ذہنی صلاحیت کے مطابق اسے ہلکے پھلکے انداز میں نئے افسانہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے نئے افسانہ اور نئے افسانہ کے پسِ منظری افسانے کے فرق کو ٹولڈ ٹریٹ منٹ اور اَن ٹولڈ ٹریٹ منٹ یعنی اشخاص، مقامات اور اعمال کی ترتیبی اور بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سمجھایا ہے کہ اس بے ترتیبی کو سمجھنے کے لیے کہانی میں اترنا ضروری ہے جس کے لیے قاری کو مشقت کرنا ہو گی۔ کیوں کہ افسانے کی یہ آب و ہوا قاری کے لیے غیر مانوس ہے۔

(ج) متفرق تنقیدی مضامین:

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے زمانۂ طالبِ علمی کے دوران سامنے آنے والے مضامین پر نظر ڈالی جائے تو اس چیز کا احساس ہوتا ہے کہ ابتداً ان کا رجحان اردو صحافت کی طرف زیادہ رہا ہے۔ ان کا پہلا مضمون "پاکستان کا پہلا اردو اخبار کوہِ نور" ہے۔ جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی "بزمِ عروجِ ادب" میں پڑھا تھا۔ یہی مضمون بعد میں اسلامیہ کالج سول لائنز کے کالج میگزین "فاران" میں مئی ۱۹۶۳ء کے شمارہ:۶ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین "لاہور پنچ، لاہور کا ایک مزاحیہ اخبار" (پندرہ روزہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ:۱۰، ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء) اور "انیسویں صدی میں پنجاب کا مزاحیہ اخبار دہلی پنچ" (پندرہ روزہ "قومی زبان" انجمن ترقی

اردو، کراچی، شمارہ: ۱۲، ۱۱، یکم و ۱۶ جون ۱۹۶۳ء) بھی ملتے ہیں۔ طالبِ علمی کے زمانہ میں یہ محققانہ کاوشیں ان کی اردو صحافت سے دل چسپی ظاہر کرتی ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ہندوستان میں صحافت کی روایت سے متعلق لکھتے ہیں:

> "ہندوستانی صحافت کا بانی ھیکی نام کا ایک انگریز تھا جس نے ۱۷۷۸ء میں کلکتہ میں ایک پریس قائم کیا اور چھپائی کا کام کرنے لگا، اس پریس سے اس نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء میں انگریزی کا ایک اخبار "ھیکیز گزٹ "Hickey's gazette" "نکالا۔ لیکن اس سے قبل ۱۷۶۸ء میں ولیم بولٹ نے جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم تھا، پریس قائم کر کے اخبار نکالنا چاہا، مگر بد قسمتی سے یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔"۲۵

صحافت سے متعلقہ مضامین میں مقامی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کی روایت بھی ملتی ہے۔ "پاکستان کا پہلا اردو اخبار کوہِ نور" (کالج میگزین "فاران" گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور، شمارہ: ۲، مئی ۱۹۶۳ء) میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس کے سنِ اجراء کے تعین کیا ہے۔ انہوں نے مختلف اخبارات کی ماہوار، ششماہی اور سالانہ قیمتوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اشاعتی دورانیہ اور اخباری پالیسی پر بھی بحث ملتی ہے۔ مثلاً "کوہِ نور" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "کوہ نور اپنے وقت کا بہت بڑا انگریز پرست اخبار تھا، چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب کہ ہندوستان کا وطن پرست پریس مجاہدین کی حمایت کر رہا تھا اور انگریز کی پالیسی پر کڑی تنقید کر رہا تھا، یہ اخبار اس وقت بھی برطانوی حکومت کے اقبال کی خیر منا رہا تھا۔"۲۶

لیکن آخری وقت میں آ کر "کوہ نور" کی پالیسی انگریز حکومت کے خلاف ہو جاتی ہے۔

"لاہور پنچ" جو کہ "اودھ پنچ" کی تقلید میں نکلا تھا ایک مزاحیہ اخبار تھا۔ یہ اخبار مغربی تہذیب کے سخت خلاف تھا۔ اس اخبار میں شائع ہونے والی نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے مغربی تہذیب اور اس کے پیروکاروں پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس اخبار سے متعلق لکھتے ہیں: "لاہور پنچ اگرچہ مزاحیہ اخبار تھا مگر ان مسائل پر پوری سنجیدگی سے غور کرتا اور نئی تہذیب کی خوب مخالفت کرتا تھا اور انگریزوں پر بغیر کسی خوف کے کڑی تنقید بھی کرتا تھا۔"۲۷

"دہلی پنچ" پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون اس کے تعارف تک محدود ہے۔ "دہلی پنچ" کے سنِ اجراء کا اندراج تو کیا گیا ہے لیکن یہ کب تک جاری رہا اس حوالے سے معلومات نہیں ملتیں۔ البتہ مضمون کے آخر پر "دہلی پنچ" کی ۱۸۸۲ء کی فائل سے اس کے معاصر اخباروں کی فہرست درج کی گئی ہے۔ جس سے قاری کو اس دور میں شائع ہونے والے اخبارات کے ناموں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال "لاہور پنچ" پر لکھے گئے مضمون میں نظر آتی ہے۔ "لاہور پنچ" کے اجراء اور یہ کب تک جاری رہا اس حوالے سے معلومات نہیں ملتیں۔ "دہلی پنچ" اور "لاہور پنچ" کی نسبت "کوہِ نور" پر لکھا گیا مضمون زیادہ اہم ہے کیوں کہ اس میں ہندوستان میں صحافت کی روایت پر بحث ملتی ہے۔ دیگر مضامین کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں اگرچہ یہ مضامین تعارفی نوعیت کے ہیں لیکن ان مضامین کا تعلق اس دور کے اخبارات سے ہے جب تہذیبی عوامل تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ ان مضامین سے اس دور کی تہذیب سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جب مغربی تہذیب کے اثرات تیزی سے قبول کیے جا رہے تھے اور "اودھ پنچ"، "لاہور پنچ" اور "دہلی پنچ" جیسے اخبارات سراپا احتجاج بنے ہوئے تھے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صحافت (اخبارات) سے متعلقہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین ادب اور جرنلزم کے طالب علموں کے لیے یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ ادب کا قاری ایک خاص دور میں جب کہ اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت مستحکم ہو رہی تھی اور جرنلزم سے تعلق رکھنے والے طالبِ علم برِ صغیر میں صحافت کی روایت سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

کسی زبان سے خیالات، افکار و علوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ جب ہم ترجمے کی بات کرتے ہیں تو اولاً ہمارے ذہن میں انگریزی سے اردو ترجمے کا تصور آتا ہے۔ لیکن تراجم دیگر زبانوں مثلاً عربی، فارسی، فرانسیسی، جاپانی وغیرہ سے بھی کیے جاتے ہیں۔ جب کسی ملک یا خطے کا ادب جمود کا شکار ہو تو تراجم اس جمود کو توڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تراجم ہی کی بدولت کسی خطے کی تہذیب و ثقافت سے واقفیت اور کسی زبان میں نئے موضوعات اور نئے پیرائیہ اظہار کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر بحث تراجم سے نہیں بلکہ ان عالمی ادبی شخصیات سے ہے جن کے نظم پاروں کا ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ترجمہ سے پہلے ان کا مختصر تعارف کرایا ہے یا الگ سے عالمی ادبی شخصیات پر مضامین لکھے ہیں جن میں ان کے موضوعات پر مختصر بحث کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "جدید جاپانی شاعری" کے عنوان سے جاپانی شاعری کے تراجم کیے ہیں جو مارچ ۱۹۸۵ء میں سہ ماہی "نیادور" کے شمارہ: ۸۰-۷۹ میں ملتے ہیں۔ لیکن شاعری کے تراجم سے پہلے انہوں نے ان شعراء کی شاعری کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ مثلاً کاذو کو شیر ائستی کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

> "کاذو کو شیر ائستی دوسری جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے شعراء کی نئی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی شاعری میں جاپان کی روایتی شاعری کا طرزِ احساس نہیں ہے۔ اس کا تعلق امریکی اور مغربی شعری رویت سے ہے... تمثال سازی میں وہ غیر روایتی شعری لغت پر یقین رکھتی ہیں۔ چونکہ وہ نئی دنیا کی شاعرہ ہے اس لیے اس نے نئی دنیا کا منظر نامہ دکھانے کے لیے نئی شعری لغت تلاش کی ہے۔"۲۸

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے نہایت مختصر انداز میں کاذو کو شیر ائستی کی شاعری ہی کا نہیں بلکہ جدید جاپانی شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات اور نئی معنوی لغت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح ہاگی وارا سکتارو کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ہاگی وارا جاپانی جدید شاعری میں صفِ اول کا شاعر ہے... اس کی شاعری کا منظر نامہ جاپان کی خوبصورت سرزمین سے تیار ہوتا ہے۔ جاپان کے درخت، پودے، ہوائیں، موسم اور نیلے پانی اس منظر نامہ میں نظر آتے ہیں مگر ان کی شعری ترسیل مغربی شاعری کی تکنیک میں ہوتی ہے۔"۲۹

پابلو نیرودا کی نظم The Height of Macchi Picchu کے ترجمہ سے پہلے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ماچو پچو کا تعارف کرایا ہے۔ جو لاطینی امریکہ میں اندیس کے پہاڑی سلسلوں پر واقع قدیم شہر کے آثار کا نام ہے۔ لیکن اس تعارف سے پہلے انہوں نے ترجمے کے مقصد اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ماچو پچو کی طبعی و تہذیبی جغرافیہ پر بات کی ہے۔ نظم "ماچو پچو کی بلندیاں" پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ تنقید کرتے ہوئے انہوں نے اس نظم کے کانتوز جو تعداد میں بارہ ہیں پر الگ الگ تنقید کرتے ہوئے ان کی معنویت کو واضح کیا ہے۔ جس سے ان کی علمی ادب پر گرفت واضح ہوتی ہے۔

کینزابورواوائے پر لکھا گیا مضمون "کینزا بورو اوائے" (سہ ماہی "ادبیات" (بین الاقوامی ادب نمبر ۳)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، شمارہ: ۴۰، ۳۹، ۱۹۹۷ء) بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کینزابورواوائے کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "اوائے جاپان کے جدید ادبی شعور سے تعلق رکھنے والا ناول نگار ہے اس نے اپنے فن کو مغربی تکنیک، ذہن، فلسفہ اور اسالیب کی مجموعی پیچیدگی میں سمو دیا ہے اور یوں وہ ناول کی تکنیک کو مقامی روایت کے شعور سے بلند کرتے ہوئے بین الاقوامی ادب کے شعور کی منزلوں تک لے گیا ہے اور جاپانی ناول نگار کا واباتا کے عہد کی روایت سے بہت مختلف نظر آنے لگا ہے۔"۳۰

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اوائے کے اسلوب کو اس کے انسانی نفسیات کے گہرے شعور، مغربی ادب کے مطالعہ اور اس کی وسیع النظری میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اوکتاویو پاز پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون اس کی شاعری پر مختلف خطوں کے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیوں کہ اوکتاویو پاز کے نزدیک شاعری علاقائی یا جغرافیائی سرحدوں میں مقید نہیں ہوتی۔ پاز کی شاعری پر ہندی دیومالا کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "لاطینی امریکہ کی تہذیبی روایت کے بعد اس کی شاعری پر سب سے گہرا اثر ہندی دیومالا کا ہے۔ وہ ہندوستان میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک بطور سفیر متعین رہا اور یہیں پر وہ ہندی دیومالا اور بدھ مت کی فینٹسی کا اسیر ہو گیا۔ شاید لاطینی امریکہ کا ماضی اس کے تہذیبی لاشعور کو وہ سر خوشی و انبساط نہ دے سکا تھا کہ جو سر خوشی اسے ہندوستان کے تہذیبی شعور نے مہیا کر دی۔ اپنا نشاطیہ مزاج کے سبب ہندی دیومالا کے نشاطیہ و جنسی پہلوؤں سے بالخصوص متاثر ہوا۔ اس کا شعر مجموعہ "East Stope" اسی عہد کی یادگار ہے۔"۳۱

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عالمی ادب پر لکھے گئے مضامین، ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے گہری تنقیدی شعور اور ذوق مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے عالمی ادب پر لکھتے ہوئے اپنے آپ کو محض ان ادیبوں کے فن پاروں تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ ان ادب پاروں کی تخلیق کے محرکات ان کی عملی زندگی سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی واضح مثال ان کے مضامین "ماچو پچو کی بلندیاں: تعارف" اور "اوکتاویو پاز" میں ملتی ہیں۔ جہاں پر انہوں نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو نیرودا کے ماچو پچو کے سفر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے کئی صدیوں پیچھے اُنکا تہذیب کی طرف بھی اشارہ کیا جہاں نظم کی تخلیق کے لیے نیرودا کو جانا پڑا تا کہ قاری کو ماچو پچو کی بلندی سے واقفیت حاصل ہو سکے۔

اوکتاویو پاز پر لکھے گئے مضمون میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے آپ کو محض اس کی ذاتی زندگی تک ہی محدود نہیں رکھا۔ قیام ہندوستان سے اس پر ہندی دیومالا کے اثرات اور جاپان میں قیام کے دوران جاپانی تکنیک رینگا سے متاثر ہونے کے نتیجے میں بالترتیب شعری مجموعے "East Stope" اور "باشو کی کٹیا" جیسی نظموں کی تخلیق کی طرف اشارات کیے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے یہ مضامین ان کی گہرے تحقیقی و تنقیدی شعور اور وسیع النظری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جو عالمی ادب کے پانچ بڑے ادیبوں کا ذوشیر ائستی، ہاگی وارا، پابلو نیرودا، کینزابوروا وائے اور اوکتاویو پاز سے نہ صرف متعارف کراتے ہیں، بلکہ ان کی شاعری، ناول نگاری کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔ نظم "ماچو پچو کی بلندیاں" کا تعارف معنی خیز ہے جس سے نہ صرف نظم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ادب کا قاری ماچو پچو کی تہذیب و ثقافت سے بھی واقفیت حاصل کرتا ہے۔

اردو ادب میں تراجم کی روایت ملتی ہے اس کے ساتھ مصنفین کا تعارف بھی ملتا ہے لیکن زیرِ ترجمہ فن پارے کی تخلیق کے پیچھے محرکات کی نشاندہی ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے۔ عالمی ادب سے متعلقہ ان کی یہ کاوشیں قابلِ تحسین ہیں جو اردو ترجمہ کی روایت میں خاطر خواہ اضافہ ہیں۔

۱۵۲۶ء میں ظہیر الدین بابر نے سلطنتِ دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی کو پانی پت کے مقام پر شکست دی کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ۱۷۶۴ء میں علی گوہر شاہ کے دورِ حکومت میں مغل افواج کو بکسر کے میدان میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے شکست ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں مغلوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ۱۸۰۳ء تک مغل بادشاہ نہ صرف انگریزوں کے محتاج ہو چکے تھے بلکہ ان کے وظیفہ خوار بھی بن گئے تھے۔ یہیں سے مغلوں کی علامتی بادشاہت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں مرزا اکبر شاہ دوم (۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ظفر

(۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء) نے علامتی حکمرانی کی اصل اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس تھے۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ تھا جسے ۱۸۵۷ء میں غداری کے الزام میں پھانسی دی گئی۔

سال ۱۸۵۷ء برِ صغیر کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ۱۸۵۷ء کے اہم واقعات اور غدر پر مضامین لکھے ہیں جو تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مضمون "سن ستاون کی ابتدائی بغاوتیں" ("اردو نامہ" مجلس زبان دفتری پنجاب، سول سیکرٹریٹ، لاہور، شمارہ:۱، ۳، ۴ جولائی ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء) ان حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے جس کے نتیجہ میں ۵۷ء کے آشوب نے جنم لیا۔ ۵۷ء کی بغاوتوں کا آغاز ایک نئے کارتوس سے ہوتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس میں گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں مقامی سپاہیوں کا خیال تھا کہ اس کارتوس کے چلانے سے ایمان جاتا رہے گا۔

" سن ستاون کی ابتدائی بغاوتیں" میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مختلف چھاؤنیوں میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ دراصل برِ صغیر کی عوام میں اپنے سفید فام آقاؤں کے خلاف نفرت شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ جس کی وجہ ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں اور ظلم و زیادتیاں تھیں۔ ہندوستان کو ان سے نجات دلانے کی سب سے پہلے کوشش میرٹھ چھاؤنی میں ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ہندوستانی سپاہیوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> "انہوں نے مسلح جدوجہد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے اپنی سعی کا آغاز مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی سے کیا۔ میرٹھ ہی وہ مقام تھا جہاں سے آزادی کا شعلہ آگ کی شکل اختیار کر کے پورے ہندوستان میں پھیلتا چلا گیا۔"۳۲

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ چھاؤنی میں ہونے والی بغاوت سے متعلق اہم واقعات جو اس بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون "۱۰ مئی اٹھارہ سو ستاون کی میرٹھ چھاؤنی" (شش ماہی "تحقیق نامہ" جی۔ سی یونیورسٹی، لاہور، شمارہ:۲۰۰۹، ۶ء) میں ملتے ہیں۔ اس مضمون سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کے آفیسروں کو بغاوت سے متعلق خفیہ معلومات پہلے ہی مل چکی تھیں لیکن وہ انہیں غیر سنجیدہ سمجھتے رہے۔ میرٹھ میں ہونے والی بغاوت کے نتیجہ میں بہت سے انگریز سپاہی مارے گئے۔ میرٹھ کے باغی سپاہی دلی کی طرف بڑھے۔ دلی میں جو کچھ ہوا اس سے متعلق اہم واقعات ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضمون "سن ستاون کی دلی" ("دریافت" نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ:۶، اگست ۲۰۰۷ء) میں ملتے ہیں۔ یہ طویل مضمون غدر کے دوران دلی میں ہونے والے واقعات کا عکاس ہے۔ جس میں دلی میں ہونے والی لوٹ مار بہادر شاہ ظفر کی کسمپرسی اور انقلابی سپاہیوں اور انگریز فوج کے درمیان ہونے والی جھڑپوں سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ یہ مضمون آشوبِ دلی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتا ہے:

> "دلی کالج دلی شہر کی سب سے ممتاز جدید علوم کی درس گاہ تھی۔ ۱۱ مئی کی دوپہر کو یہ درس گاہ دلی کے شہریوں اور سپاہیوں نے لوٹ لی۔ اس درس گاہ کی میز کرسیاں، نہایت قیمتی سائنسی آلات، کتب خانہ، نقشہ جات وغیرہ لوگ لوٹ کر لے گئے، کمروں کی چوکھٹ اور دروازے تک نکال لیے گئے۔"۳۳

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس دور کے خطوط، اخباری رپورٹوں، روزنامچوں، ڈائریوں اور اردو و انگریزی ماخذوں سے مدد لیتے ہوئے سن ستاون کے واقعات اور دلی کی نئی حکومت کو درپیش مسائل کا ذکر کیا ہے:

> "مالی مشکلات، بارود کی قلت، تنظیم کی کمی اور قائدانہ صلاحیتیں میسر نہ آنے کی وجہ سے سپاہ دلی کو بار بار ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ فوج کے اندر اتفاق اور قیادت کو تسلیم کرنے کا جذبہ نہ

تھا۔ سردار باہمی رقابتوں اور کم تر درجے کی سیاست کا شکار تھے۔ وہ لوگ بہادر شاہ کا حکم ماننے سے گریز کرتے تھے۔"۳۴

مغل حکمران فرخ سیر کا ایسٹ انڈیا کمپنی کو بلا محصول تجارت کی اجازت دینا، مغل افواج کی ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر میں شکست، باہمی نفاق، قیادت کا فقدان اور مناسب حکمت عملی کا نہ ہونا جیسے محرکات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مضبوط بنا دیا جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کے آشوب نے جنم لیا۔ لیکن ۵۷ء کی جنگ کے دوران بھی برِ صغیر کے عوام انتشار کا شکار رہے جو شکست کی وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ تھی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین سن ستاون کا عکس پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے دن بہ دن بگڑتی صورت حال کو ترتیب کے ساتھ ایک خاص پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جس سے تاریخ کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے۔ ان کے مضامین سن ستاون کی تاریخ ہی نہیں بلکہ تاریخ کے ایک حصے سے متعلقہ اہم کرداروں سے بھی واقفیت کا سبب بنتے ہیں۔

مضمون "سن ستاون کی ابتدائی بغاوتیں" میں حوالہ جات کا اہتمام نہیں ملتا۔ مثلاً بیج ناتھ سپاہی نے جو کہا اسے اقتباس کی صورت میں درج کیا گیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا گیا۔ البتہ "۱۰ مئی اٹھارہ سو ستاون کی میرٹھ چھاؤنی" اور "سن ستاون کی دلی" میں حوالہ جات ملتے ہیں۔ مؤخر الذکر مضمون کے آخر پر تصاویر کا اہتمام کیا گیا ہے جو قاری کی دل چسپی کا باعث بنتی ہیں۔ زمانی اعتبار سے واقعات کا بیان تاریخ کے اس اہم باب کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اولین ماخذوں تک رسائی میں از حد کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضامین تاریخی دستاویزات کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں جو آئندہ کے مؤرخین کے لیے بطور حوالہ اور تاریخ کے ایک اہم حصے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ پیرائے بیان کی تکنیک کی بدولت ان مضامین میں تاریخ کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ستاون کی بغاوتیں، میرٹھ چھاؤنی کے واقعات اور آشوب دلی کے مناظر کا بیان قاری کے سامنے ان سب کی حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے گویا اس نے تاریخ کو خود دیکھا ہو۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں کا اہتمام اگرچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے جنم لینے والی محرومیوں کے خاتمے کے لیے کیا گیا لیکن یہ مشاعرے جدید اردو شاعری کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس حوالے سے تفصیلی بحث ہمیں "نظم آزاد" مرتبہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مقدمہ میں ملتی ہے۔ جو جدید شاعری کے آغاز اور مسلمانوں کی ابتر صورت حال کا عکاس ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں نہیں رُکتا انجمن پنجاب پر لکھے گئے مضامین بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

"انجمن پنجاب کی شعری تحریک (کچھ نئی اطلاعات)" (شش ماہی "بازیافت" شعبۂ اردو، اورئینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ:۱۲، جنوری، جون ۲۰۰۸ء) میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری "نظم آزاد" کے مقدمہ سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے یہاں انجمن پنجاب کے مشاعروں اور جدید شاعری کے اصل محرک کون تھے؟ جیسے امور پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ۱۸۷۳ء میں قائم ہونے والی نصاب کمیٹی کی سفارشات اور لیفٹیننٹ گورنر کے نوٹ کا حوالہ دیتے ہوئے جدید شاعری کے محرکات کی نشاندہی کی ہے:

> "ان کا کہنا یہ تھا کہ اس وقت (دسمبر ۱۸۷۳ء) جو درسی کتب صوبے میں رائج ہیں، ان میں اردو نظم بالکل نہیں ہے، حالاں کہ عمدہ نظم تعلیم کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہدایت کی جاتی ہے کہ اس مسئلے پر غور کریں کہ کیا ہمارے مدارس میں اردو نظم کا ایسا انتخاب شامل نہیں ہو سکتا کہ جس میں اخلاقیات اور نصائح پر زور دیا جائے اور ہر ایک چیز کی تصویر کشی کی جائے۔"۳۵

جس قسم کی نظموں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اردو میں موجود نہ تھیں۔ لہٰذا ہالرائیڈ نے ہندوستانی تہذیبی روایات کے پیشِ نظر مشاعروں کی طرف توجہ کی اور حالی اور آزاد سے رابطہ کیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان امور پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کی شعری تحریک کے اصل محرکات حالی یا آزاد نہیں تھے:

"لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی ہدایات کے مطابق کرنل ہالرائیڈ نے درسی کتب میں منظومات کا اضافہ کرنے کے لیے مناظر فطرت اور پند و نصائح والی نظموں کے حصول کے لیے مشاعروں کا اہتمام کیا تھا۔ ان مشاعروں میں حالی اور آزاد Subaltern Characters کی حیثیت رکھتے ہیں۔"۳۶

جس دور میں انجمن پنجاب نے جدید شاعری کا تصور پیش کیا اس دور میں اس پر تنقید بھی کی گئی۔ "انجمن پنجاب کی شعری تحریک (کچھ نئی اطلاعات)"میں جدید شاعری پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "انجمن پنجاب کی ایک نایاب رپورٹ (۱۸۷۴ء۔۱۸۶۹ء)" (سہ ماہی "معیار" انٹر نیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ:۹، جنوری، جون ۲۰۱۳ء) اہم تحقیقی کاوش ہے۔ اس مضمون میں رپورٹ سے پہلے انجمن پنجاب کی علمی و ادبی خدمات اور انجمن کے زوال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر پر انجمن پنجاب کی رپورٹ اس کی اہم کاوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔

انجمن پنجاب پر لکھے گئے مضامین تحقیقی اور معلوماتی ہیں۔ جو اس امر کی نفی کرتے ہیں کہ حالی اور آزاد کی کوششوں سے انجمن پنجاب کے مشاعرے شروع ہوئے۔ مقدمہ "نظم آزاد" میں دھندلی رہ جانے والی تصویریں ان مضامین میں واضح ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان مضامین میں تاریخ اور ادب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ "انجمن پنجاب کی شعری تحریک" کے آخر پر تنقیدی مضامین کے حوالے اس دور کے تنقیدی رویوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے جدید شاعری کے آغاز پر ابتدائی سطح پر سامنے آنے والا ردعمل واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں جدید شاعری کو کس نظر سے دیکھا گیا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہونے والے کالم کا اندراج مضمون کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ مضامین بیک وقت انجمن پنجاب کے محرکات، انجمن کے مشاعروں، جدید شاعری کے آغاز اور اس میں نمایاں کردار ادا کرنے والی شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے اہم اور اولین نقادوں میں ہوتا ہے۔ آبِ حیات اور دیوان ذوق کا مقدمہ ان کے تنقیدی شعور کا غماز ہے۔ جس سے ان کی تہذیبی شخصیت سامنے آتی ہے۔ لیکن ۱۸۸۵ء کے بعد ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ جو آبِ حیات، سخن دان فارس اور دربار اکبری سے مختلف ہے۔ آزاد کی شخصیت کے اس پہلو کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مضمون "آزاد کا عالم دیوانگی" ("تخلیقی ادب" نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ:۷ جون ۲۰۱۰ء) میں آزاد کی شخصیت کا مطالعہ مختلف ادوار کی صورت میں کیا ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل آزاد ایک نارمل انسان کی صورت میں نظر آتے ہیں لیکن ۵۷ء کے واقعات نے ان کے اعصاب پر گہرا اثر کیا۔ ان واقعات میں ایک اہم واقعہ آزاد کے والد کو پھانسی پر لٹکانا ہے۔ آزاد کو اس موقع پر اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ ۱۸۶۱ء میں عام معافی کے اعلان پر آزاد نے انگریز حکومت کی ملازمت اختیار کر لی اور پھر ۱۸۸۵ء میں آزاد کی شخصیت کا دوسرا پہلو جو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین کا موضوع بھی ہے وہ سامنے آتا ہے یعنی آزاد کا عالم دیوانگی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے آزاد کی زندگی سے مثالیں دیتے ہوئے ان کے عالم دیوانگی کی وجوہات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آزاد کی سائیکی پر ۵۷ء کے واقعات کا گہرا اثر تھا۔ ۶۱ء میں انہوں نے پرامن ادیب کا پرسونا (Persona) اختیار کر لیا۔ لیکن پھر کیا وجوہات تھیں کہ آزاد عالم دیوانگی میں مبتلا ہوئے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان وجوہات یا حادثات کی طرف اشارہ کیا ہے:

"آزاد اپنے پرسونا میں نہایت مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے کہ ۸۵۔۱۸۸۴ء میں کچھ ایسے حادثات مسلسل طور پر ہوئے جن سے ذہنی طور پر انہیں سخت نقصان پہنچا۔ ان حادثات کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مکان کو آگ لگنے کا نقصان ہوا۔

۲۔ اس آگ میں مولانا آزاد کی پھوپھی جنہوں نے آزاد کو ماں کی محبت دی تھی جل گئیں۔ اس واقعہ کا آزاد کے ذہن پر سخت صدمہ پہنچا۔

۳۔ ان کی نہایت پیاری بیٹی امتہ السکینہ عنفوان شباب میں فوت ہو گئی۔

اس آخری صدمے نے ان کی ذہنی صلاحیت کو نقصان پہنچایا۔"۳۷

سن ستاون کے غدر سے جو مصیبت ان پر ٹوٹی اور پھر بعد کے حالات نے ان کے ذہن پر گہرا اثر کیا۔ اور جو پر سونا انہوں نے ۶۱ء میں اختیار کیا تھا وہ بکھر گیا۔ اس کے باوجود ان کا تخلیقی عمل کسی بھی سطح پر رکتا نہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "محمد حسین آزاد: جنون اور رسائل جنون" (جرنل آف ریسرچ اردو، بہاالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، شمارہ:۱۷، جون ۲۰۱۰ء) میں انہوں نے عالم جنون میں لکھی گئی تحریروں اور بدلتے ہوئے موضوعات کی نشاندہی کی ہے۔ نارمل زندگی میں جہاں آزاد کے ہاں شعر وادب اور لسانیات جیسے موضوعات ملتے ہیں عالمِ دیوانگی میں یہی موضوعات فلسفیانہ افکار میں بدل جاتے ہیں:

"اب ان کے تخلیقی باطن کا مرکز تبدیل ہونے لگتا ہے۔ شناخت کے مصادر بدلنے لگتے ہیں۔ پہلے ولی، انشا اور ذوق ان کے پسندیدہ کردار تھے۔ مگر اب یزداں، ہیر مند، زرتشت اور مہاراجہ جے چند ان کے مرغوب کردار بن جاتے ہیں۔ دراصل عالمِ جنون میں جو کچھ ان کے لاشعور کی رو کہنا چاہتی ہے وہ ان کرداروں کے حوالے سے کہتے ہیں۔"۳۸

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے عالم جنون میں لکھے ہوئے سرمائے سے مختلف اقتباسات کے ذریعے مولانا آزاد کی ذہنی کیفیت کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے ابنارمل سائیکولوجی کے ماہرین کی آراء (اکثر مریض جنون کی حالت میں خود کو کوئی بڑا رہنما سمجھنے لگتے ہیں) سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور ایسی کیفیات کو انہوں نے "فلسفہ الٰہیات" اور "سپاک و نماک" سے اقتباسات درج کرتے ہوئے واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مطالعۂ احوال کے ذریعے آزاد کے باطن تک رسائی حاصل کی ہے۔ فرائڈ نے تحلیل نفسی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ مطالعۂ احوال ہی کا تھا۔ مطالعۂ احوال کے لیے ضروری ہے کہ محقق نفسیات کے علم سے واقفیت رکھتا ہو۔ مطالعۂ احوال میں کسی شخصیت کی ذاتی زندگی اور اس کی تخلیقات کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ ان مضامین میں آزاد کے عالم جنون کا مطالعہ اسی سیناریو میں کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے آزاد پر لکھے گئے ان مضامین میں آزاد کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ زمانۂ غدر کے دوران ہونے والے مظالم کی بھی روداد بیان کی ہے۔ ان مظالم نے انسانی ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کی واضح مثال مولانا آزاد کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ان مضامین کی تاریخی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہ ایک خاص دور میں ہونے والے اہم واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سر سید احمد خاں ایک عہد ساز شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کے تقریباً ہر شعبہ ہائے زندگی مثلاً ادب، مذہب، سیاست، صحافت، تعلیم اور معاشرت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک عہد ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سر سید اور سر سید تحریک پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان پر لکھے گئے سرمائے میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید کی سیاسی بصیرت اور جداگانہ قومی تشخص کے نظریے پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "سر سید احمد خان اور تھیوڈور بیک" (ماہ نامہ، "نئی قدریں" حیدر آباد (سندھ)، شمار:۱۹۸۱، ۶، ۵ء) اہمیت کا حامل ہے۔ سر سید کے جداگانہ قومی تشخص کے نظریے کی شدید مخالفت کی گئی۔ مخالفت کرنے والوں میں نیشنلسٹ اور علماء شامل تھے۔ سر سید کی سیاسی شخصیت کو مسخ کرنے کی بھی کوشش کی گئی اس کے لیے علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کا سہارا لیا گیا اور کہا گیا کہ سر سید نے انہی کی تحریک پر جداگانہ قومیت کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس

نقطۂ نظر کی حامل شخصیات میں شبلی، مولوی طفیل احمد منگلوری، ایس۔ ایم جین اور عتیق صدیقی کے نام لیے ہیں۔ سرسید کے خلاف پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنی تحقیق سے غلط ثابت کیا ہے:

> "سرسید کے تمام تصورات ان کی ذاتی سوچ کا نتیجہ تھے۔ سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ سرسید کو بیک نے جداگانہ قومیت کے تصور کی طرف مائل کیا اس الزام کی تاریخی طور پر تردید ہوتی ہے کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ بیک کی آمد سے بہت پہلے ۱۸۶۷ء میں ہی سرسید جداگانہ قومیت کے تصور پر یقین لے آئے تھے۔"۳۹

انہوں نے "حیاتِ جاوید" سے اقتباس دے کر اپنے مندرجہ بالا نقطۂ نظر کی تصدیق کی ہے۔

مضمون "سرسید: انیسویں صدی کی ایک میگا فورس" ("پین" پاکستان لٹریری جرنل، لاہور،، جلد:۳، دسمبر ۲۰۰۹ء) میں سرسید کی ذہنی بصیرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ مضمون میں سرسید کے تعلیم سے متعلقہ نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسید مردوں کے لیے تو تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں لیکن عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے انہوں نے آواز بلند نہیں کی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "سفر نامۂ پنجاب" سے حوالہ دیتے ہوئے عورتوں کی تعلیم سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "اردو تحقیق کا ابتدائی دور ا(سرسید احمد خان)" ("بنیاد" لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، لاہور، جلد:۲، شمارہ:۲، ۲۰۱۲ء) خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں سرسید کے حوالے سے ان کی مختلف تحقیقی و تدوینی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق اور تدوین کے دوران جن مسائل کا سامنا سرسید کو کرنا پڑا ان کا ذکر بھی اس مضمون میں ملتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اردو تحقیق کے ابتدائی دور پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد سرسید کی تحقیقی و تدوینی خدمات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے "آثارالصنادید" اور "آئینِ اکبری" کے طریقِ تحقیق و تدوین پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو میں پہلا تحقیقی کام "آثار الصنادید" ہی کی صورت میں ملتا ہے: "سرسید نے آثار قدیمہ اور تاریخی کتب کی تدوین کا کام انیسویں صدی کی ربع صدی سے پہلے سرانجام دیا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو تاریخی تحقیق کا آغاز سرسید نے کیا تھا۔"۴۰

سرسید پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے لکھے ہوئے مضامین ان حقائق کو سامنے لاتے ہیں جن کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ قیامِ لندن کے دوران لکھا گیا خط اور خط سے پہلے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی وضاحت سرسید کی مغربی تہذیب و ثقافت سے لگاوٹ کو ظاہر کرتی ہے۔

سرسید نے غالب کو "آئین اکبری" کی تقریظ لکھنے کا کہا تھا۔ غالب نے تقریظ لکھی بھی لیکن اسے دورانِ اشاعت شامل نہ کیا گیا۔ اس کی وجہ بھی انہی مضامین میں ملتی ہیں نیز تقریظ کے کچھ حصے اردو ترجمہ کے ساتھ مضمون "اردو تحقیق کا ابتدائی دور" میں شامل کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی تقریظ کے پسِ پردہ مغربی تہذیب اور ٹیکنالوجی جیسے محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے غالب سفر کلکتہ اور قیامِ کلکتہ کے دوران متعارف ہوئے اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

سرسید پر لکھے گئے مضامین سے ان کے نظریۂ قومیت پر کیے گئے اعتراضات اور پسِ پردہ حقائق سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مضامین عہدِ سرسید کے عکاس ہیں۔ ادب کا قاری ان مضامین کے مطالعہ سے سرسید تحریک، عہدِ سرسید میں مغربی تہذیب و ثقافت، آئینِ اکبری اور آثار الصنادید کے طریقِ تحقیق، غالب کی جدت پسندی غرض ایک پورے عہد سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے یہ مضامین تاریخ اور تاریخِ ادب کے لحاظ سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ قاری کو عہدِ سرسید کے متعلق ایک وژن مہیا کرتا ہے۔

تاریخ کے گوشوں میں کچھ شخصیات یا کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں تاریخ اپنے سینے میں محفوظ کر لیتی ہے اور پھر کوئی محقق انہیں تاریخ کے تاریک گوشوں سے نکال کر متعارف کراتا ہے اور قاری ان کے بارے میں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ کیا تاریخ میں ایسی شخصیات

بھی ہیں جن سے ہم اب تک ناواقف تھے۔ یہ اعزاز محققین ہی کو حاصل ہے جو اپنے دور کی مشہور شخصیات کو عصرِ حاضر میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ایسے ہی کرداروں میں پنڈت من پھول کا شمار ہوتا ہے۔ جس کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ تاریخ کا ایک اہم واقعہ رنگین مزاج ولیم فریزر کا قتل بھی ہے۔ جس پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "ولیم فریزر کا قتل، نواب شمس الدین اور لوک گیت فریجن" ("دریافت" نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ:۵، ۲۰۰۶ء) ہے۔ اس مضمون میں ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس قتل کا الزام نواب شمس الدین پر لگا اور انہیں قتل کی سزا سنادی گئی۔ اس قتل سے متعلق غالب کے خطوط میں بھی کچھ معلومات ملتی ہیں جن کا ذکر مضمون میں کیا گیا ہے۔ ولیم فریزر کو رنگین مزاج اس لیے کہا گیا کہ وہ مقامی عورتوں کا شیدائی تھا:

> "عمر بھر اس کے کتنی عورتوں سے تعلقات رہے اس کے بارے میں تو کچھ کہنا بہت مشکل ہے مگر دلی میں اس کے حرم میں چھ-سات باقاعدہ بیویاں موجود تھیں جو سب کی سب دیسی عورتیں تھیں... وہ میوات کے علاقے میں ایک ہیرو کی طرح مشہور تھا اور اس علاقے میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بالآخر وہ لوک گیتوں کا ہیرو بن گیا تھا۔ یورپین لوگوں میں شاید وہ واحد شخص تھا جو لوک گیتوں میں ظاہر ہوا تھا۔"۴۱

مضمون کے آخر پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے آغا حیدر حسن دہلوی کا ایک نوٹ فریزر اور میواتی دوشیزہ "سرون" پر لکھے گئے گیت کے ساتھ شامل کیا ہے۔ جس سے ولیم فریزر کی رنگین مزاج طبعیت اور فریجن سُروں کے گیت کی خاص دُھن سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ جو کہ اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

پنڈت من پھول پر لکھا گیا مضمون "پنڈت من پھول: انجمن پنجاب اور وسط ایشیاء کی تاریخی مہم کا ایک ممتاز کردار" (سہ ماہی "معیار" انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ:۵ جنوری، جون ۲۰۱۱ء) ہمیں تاریخ کے ایک ممتاز کردار سے متعارف کراتا ہے۔ انیسویں صدی کے علمی افق پر نمودار ہونے والی شخصیات میں ایک اہم نام پنڈت من پھول کا بھی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے مضمون میں انجمن پنجاب، پنجاب کے انتظامی معاملات اور خارجی معاملات میں پنڈت من پھول کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ وسط ایشیاء کی مہم میں مولانا آزاد اور منشی فیض بخش کے ساتھ پنڈت من پھول کا نام بھی ملتا ہے۔ جو اس مہم میں نگران کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس مہم کی رپورٹ جو کہ پنڈت من پھول نے تیار کی تھی وہ بھی مضمون کا حصہ ہے۔ مضمون کے آخر پر پنڈت من پھول کی وفات پر اخبار انجمن پنجاب میں شائع ہونے والی رپورٹوں کا عکس دیا گیا ہے۔ جو پنڈت من پھول سے متعلق اہم معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔

ولیم فریزر کے قتل اور پنڈت من پھول پر لکھے گئے مضامین تاریخ کی دو اہم شخصیات سے متعارف کراتے ہیں۔ ولیم فریزر کے قتل پر لکھے گئے مضمون میں شامل جنرل ہروے (Jeneral Hervey) کا اقتباس قتل کے اصل محرکات سے پردہ اٹھاتا ہے۔ پنڈت من پھول پر لکھا گیا مضمون نہ صرف انجمن پنجاب کی ابتداء بلکہ ابتداء میں درپیش مسائل کے ساتھ ۱۸۴۶ء میں سکھوں کی شکست کے بعد برطانوی حکومت کو انتظامی معاملات میں درپیش مسائل کے علاوہ وسط ایشیاء کی مہم کے محرکات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تاریخی کرداروں پر لکھے گئے یہ مضامین دو اہم سیاسی اور ادبی شخصیات کے متعلق اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مضامین تحقیقی و معلوماتی تو ہیں لیکن ادبی لحاظ سے ان کا مقام وہ نہیں جو تاریخی و سیاسی لحاظ سے ہے۔ پھر بھی انجمن پنجاب سے متعلقہ ابتدائی معلومات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندی صنفِ سخن "گیت" سے متعلق بھی کچھ معلومات ملتی ہیں جو اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن تاریخ اور سیاست کے باب میں یہ مضامین ایک خاص عہد کے سیاسی مسائل سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اس طرح تاریخ و سیاست سے ان کا تعلق زیادہ گہرا بنتا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا شمار اردو کی اہم نثر نگار شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی تربیت لکھنؤ کی گلیوں میں ہوئی۔ انہیں "فسانۂ آزاد" کی تخلیق نے خاص شہرت عطا کی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "سرشار کی ایک قدیم تحریر" (ماہ نامہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو، کراچی، شمارہ:۱۲، فروری۱۹۷۸ء) میں سرشار کے نقاد پریم پال اشک کے بیانات کی تردید کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بشن نرائن در کے مضمون "رتن ناتھ-اے سٹڈی" کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جسے اشک نے سرشار پر لکھا گیا پہلا مضمون قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "نیو سکول آف اردو لٹریچر" میں شامل شیخ عبد القادر کے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے اشک کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ مضمون میں اشک کے اس بیان کی بھی تردید کی گئی ہے کہ سرشار نے "قندیلِ حرم" از نواب کلب علی خاں پر ۱۸۷۳ء میں جو تقریظ لکھی اس سے بہت پہلے سرشار کے مضامین کشمیر درپن، مراسلۂ کشمیر، ریاض الاخبار اور مراۃ الہند میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان رسائل کے سنِ اجراء کا اندراج کیا ہے۔ اس سے جہاں اشک کے غیر محققانہ بیانات کی تردید ہوتی ہے وہیں ہمیں اردو کے ان قدیم رسائل کے سنِ اجراء سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

ادب کی تعمیر و تشکیل اعلیٰ ادبی ذہنوں اور ان ذہنوں کی تخلیقات کی مرہونِ منت ہے۔ ان اعلیٰ ادبی ذہنوں کو اپنی صلاحیتوں کا احساس دلانے اور ان کی شخصی تعمیر میں ایک استاد کا کردار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس کی اپنی شخصیت کا عکس بھی ان اعلیٰ ذہنیت کے حامل ادیبوں کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

اگرچہ مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مقصد انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا ہوتا ہے لیکن یہ مضامین ان کی داخلی زندگی کو سمجھنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بھی اپنے ماضی کو کریدتے ہوئے مختلف شخصیات پر مضامین لکھے ہیں۔ ان کا مضمون "پروفیسر حمید احمد خاں-چند تاثرات" (کالج میگزین "فاران (یادگار نمبر)" گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، لاہور، مارچ ۱۹۷۵ء) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون سے پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو انہیں دیگر شخصیات سے ممتاز بناتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے زمانۂ طالب علمی میں پیش آنے والے واقعات کے بیان سے پروفیسر حمید احمد خاں کی شخصیت کو واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "خاں صاحب کی شخصیت ایک اونچے اور گھنے سائے والے درخت کی سی تھی، جس کے سائے کے تصور ہی سے سکون ملتا تھا۔ ملتے تو شفقت، محبت اور خلوص کا دریا بہنے لگتا اور یوں معلوم ہوتا کہ جیسے اس گھنے درخت کے سائے اور پھیل گئے ہیں۔ یہ شخصیت کا جادو تھا جب چلتا تھا تو اس کے پھیلاؤ اور وسعت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔"۴۲

ڈاکٹر وحید قریشی پر لکھا گیا مضمون "محقق گر محقق" (شش ماہی "مخزن" (وحید قریشی نمبر)، قائدِ اعظم لائبریری، لاہور، شمارہ:۱۰، ۲۰۱۰ء) ان کے تحقیقی نظریات سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان سے مختلف اوقات میں ہونے والی ملاقاتوں کے دوران ہونے والی علمی گفتگو سے ان کے تحقیقی نظریات اور طریقِ تحقیق کو واضح کیا ہے۔ دورانِ تحقیق مصادر کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی انہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹر وحید قریشی جب کسی موضوع پر کام کرنے کا فیصلہ کرتے تو اپنی تمام تر ممکنہ کوششوں سے مواد کی فراہمی کا کام شروع کر دیتے۔ مواد کی فراہمی صرف بنیادی اور اہم مصادر تک محدود نہ رہتی۔ وہ ثانوی مصادر کے لیے بھی یکساں طور پر سعی کرتے تھے، بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے ماخذوں تک رجوع کرنا ضروری سمجھتے تھے اور یہ ان کی اخلاقیات تحقیق کا حصہ تھا۔ مجھے یاد ہے کی جب میں نے تحقیق کی ابتداء کی تو مجھ سے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی بھی

حالت میں کسی ماخذ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بعض اوقات کسی عام ماخذ میں کہی گئی کوئی بات بے حد اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے اور اگر یہ ماخذ استعمال نہ کیا جائے تو تحقیق میں خلا رہ جائے گا۔"۴۳

"محقق گر محقق" میں ڈاکٹر وحید قریشی کی دستاویزی تحقیق کے فن پر دسترس اور کتاب دوستی ظاہر ہوتی ہے۔ مضمون میں شامل "کدم راؤ پدم راؤ" پر لکھا ہوا ان کا تبصرہ ان کی متن شناسی کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے متن کی داخلی شہادتوں سے مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" کے عہد کے تعین کا تعین کرنے کی سعی کی۔

سجاد باقر رضوی پر لکھا گیا مضمون ان کی علم دوستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مضمون میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کی عملی زندگی سے کچھ واقعات اور ان سے ہونے والی ملاقاتوں کا احوال بیان کیا ہے۔ یہ ملاقاتیں اور واقعات ان کی شخصیت کا ایک منفرد پہلو سامنے لاتے ہیں۔ انہیں تمباکو نوشی اور کتاب بینی پسند تھی۔ وہ اپنی محدود آمدنی سے ہفتے میں کم سے کم ایک بار طلبہ کو بسکٹ اور چائے پلاتے تھے۔ ایلیٹ اور ژونگ کے علاوہ ایرک فرام سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ انہیں ژونگ کے نظریات سے خصوصی دل چسپی تھی۔

پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی پر لکھے گئے مضامین جہاں ان عظیم شخصیات کی داخلی زندگی کے مختلف پہلو سامنے لاتے ہیں وہیں ان سے اردو میں تحقیق کی روایت سے متعلق بھی مختصر معلومات ملتی ہیں۔ اس ضمن میں "محقق گر محقق" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جو نہ صرف ڈاکٹر وحید قریشی کی محققانہ بصیرت کا غماز ہے بلکہ اس سے اصولِ تحقیق کے ساتھ ساتھ تحقیق کے میدان میں بنیادی و ثانوی مصادر کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کچھ مضامین اپنے معاصرین پر بھی لکھے ہیں۔ صفدر میر پر ان کا مضمون "محمد صفدر میر کی یاد میں" (ماہ نامہ "علامت" لاہور، شمارہ:۷، اپریل ۱۹۹۹ء) کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کی ابتداء میں لاہور شہر کو ۶۰ء کی دہائی میں فن کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ انہوں نے نئی شاعری کو موضوع بناتے ہوئے صفدر میر کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

جیلانی کامران پر لکھا گیا مضمون "جیلانی کامران کی تہذیبی روایت" (یونیورسٹی میگزین "راوی" (پہلا یونیورسٹی شمارہ)، جی۔ سی یونیورسٹی، لاہور، ستمبر ۲۰۰۳ء) ان کے تہذیبی لگاؤ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کے تہذیبی جغرافیہ کو اقبال کے تہذیبی جغرافیہ سے مماثل قرار دیا ہے۔

شہزاد احمد پر لکھا گیا مضمون "شہزاد صاحب" (شش ماہی "مخزن" (شہزاد احمد نمبر)، قائدِ اعظم لائبریری لاہور، شمارہ:۲۴، ۲۰۱۲ء) شہزاد احمد کی علم نفسیات پر ان کی دسترس اور لگاؤ کی عکاسی کرتا ہے۔ شہزاد احمد علمی و ادبی مسائل پر لمبی لمبی بحثیں کرتے تھے۔ انہوں نے نفسیات کی متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علم نفسیات پر ان کی دسترس کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"شہزاد صاحب اکیلے ہوتے تھے تو ان کی گفتگو میں نفسیات کے مسائل اکثر آجایا کرتے تھے۔ باتوں باتوں میں وہ نفسیات کے دقیق مسائل بڑی شگفتگی سے یوں بیان کرتے تھے جیسے یہ ان کے اپنے دریافت کردہ مسئلے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر اجمل کے بعد فرائیڈ اور ژونگ کے مسائل میں شہزاد صاحب جس روانی اور تفہیم کا مظاہرہ کر سکتے تھے ایسی قوت بہت کم اصحاب کو حاصل تھی۔"۴۴

پروفیسر حمید احمد خاں اور سجاد باقر رضوی پر لکھے گئے مضامین میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے خارج سے داخل کی طرف سفر کیا ہے۔ جس سے ادب کی دو نامور شخصیات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وحید قریشی پر لکھا گیا مضمون اگرچہ ان کی داخلی زندگی سے متعلق نہیں البتہ اصولِ تحقیق، تحقیق کی روایت اور طریقِ تحقیق کو سمجھنے میں یہ مضمون اہمیت رکھتا ہے۔

شہزاد احمد، جیلانی کامران اور صفدر میر پر لکھے گئے مضامین تنقیدی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں ان شخصیات کے فن پر بحث ملتی ہے۔ اگرچہ یہ مضامین فن اور فنی رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن کسی شخصیت کو سمجھنا زیادہ معنی رکھتا ہے کیوں کہ فن پارہ اپنے فن کار کی اس طرح عکاسی نہیں کر سکتا جس طرح کسی فن کار کی شخصیت اس کے فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ یہاں فن پارے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا بلکہ کسی فن کار کی داخلی زندگی کے مطالعہ سے شخصیت کے جو پہلو سامنے آتے ہیں ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحقیق کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ تحقیق ہی ہے جو انسانی ذہن کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی سے منور کرتی ہے۔ ادبی تحقیق کی باقاعدہ روایت ایک صدی پر محیط ہے۔ اس دوران آنے والے محققین نے اسے وقتاً فوقتاً جدید اصولوں سے آراستہ کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "ادب اور تحقیق" (پاکستانی ادب، مرتبین، رشید امجد م فاروق علی، جلد:۵، جنوری ۱۹۸۲ء) اسی روایت کا حصہ ہے۔ جس میں انہوں نے تحقیق کے مختلف طریقوں، دورانِ تحقیق پیش آنے والے مسائل یہاں پر مسائل سے مراد وہ امور ہیں جو محقق کو صحیح ڈگر سے پرے لے جاتے ہیں مثال کے طور پر مواد کا وافر مقدار میں نہ ہونا یعنی کمزور حوالہ جات پر یقین یا کسی عبارت یا دستاویز کا غلط مطالعہ یعنی متن کو غور سے نہ پڑھنا جیسے مسائل پر بحث کی ہے۔ یہ ایسے امور ہیں جو محقق کے بھٹکا دیتے ہیں۔ انہوں نے مضمون میں مختلف محققین سید طفیل احمد منگلوری، عبدالباری آسی اور محمد حسین آزاد کے حوالے دیتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

تحقیق ہی کی حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا دوسرا مضمون اردو کے نامور محقق رشید حسن خاں پر "رشید حسن خاں اور تحقیق کا کلٹ (Cult) "(شش ماہی "بازیافت" شعبۂ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ:۲۲، جنوری، جون ۲۰۱۳ء) ہے۔ جس کے ابتداء میں انہوں نے رشید حسن خاں کا تعارف بطور محقق کے تحسینی انداز میں کرایا ہے۔ جس سے رشید حسن خان کا نظریۂ تحقیق واضح ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ حقائق ہی کی طرف رہی ہے۔ ان کے نظریۂ تحقیق میں زرہ برابر بھی لچک نہیں ملتی وہ تحقیق اور تنقید کو دو بالکل الگ الگ خانوں میں رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جدید اصولِ تحقیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رشید حسن خاں کے نظریۂ تحقیق کی وضاحت کی ہے۔ جدید تحقیق میں تحقیق اور تنقید کو الگ الگ نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے نزدیک حقائق کی بازیافت تحقیق کا اولین مرحلہ ہے جب کہ ان حقائق کی تفہیم و تجزیہ دوسرا مرحلہ ہے اور جب تک ان دونوں مراحل کو عبور نہ کر لیا جائے کامل تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ جب کہ رشید حسن خاں اپنی تحقیق کو پہلے مرحلہ تک محدود رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے انلس دبستان کے حوالے سے بین الشعبہ جاتی مطالعات کے ذریعے علوم و فنون کے درمیان ایک وسیع اشتراک کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس سے ان کا اپنا نظریۂ تحقیق بھی سامنے آتا ہے اور رشید حسن خاں کا بھی جس کے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو تحقیق کے متعلق رشید حسن خاں کا نظریہ محدود اور عالمی معیارات سے بہت دور تھا۔ حقائق کی تلاش بلاشبہ تحقیق کا اولین مرحلہ ہے اور تحقیقی کام کی بنیاد اسی پر استوار ہوتی ہے مگر حقائق تحقیق کی تکمیل نہیں کرتے۔ حقائق تو تحقیق کے سفر کی اہم کڑی ہے۔ صرف حقائق پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ تحقیق کو اس کے مکمل روپ میں دیکھنے سے گریز کر رہے ہیں۔"۴۵

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو تحقیق سے متعلق ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین تحقیقِ ادب اور کامل تحقیق کا ایک مکمل تصور پیش کرتے ہیں۔ تحقیقِ ادب سے متعلق ان کے نظریات "ادبی تحقیق کے اصول" میں اور تاریخِ ادب سے متعلق نظریات "اردو ادب کی تاریخ

(ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک)" میں ملتے ہیں۔ ان مضامین میں بھی ہمیں انہی نظریات کا پرچار ملتا ہے۔ لیکن "رشید حسن خاں تحقیق کا کلٹ" میں رشید حسن خان کے نظریہ تحقیق کی وضاحت کے ساتھ تاریخِ ادب سے متعلق نظریات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس مضمون میں دراصل رشید حسن خاں کی تحقیق کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان کی تحقیق حقائق کی بازیافت تک تو پختہ اور کڑے معیارات کی حامل ہے لیکن تفہیم و تجزیہ کا عنصر اس میں نہیں ملتا۔ جسے موجودہ دور میں تحقیق کا لازمی جز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیقی خدمات سے انکار ممکن نہیں انہوں نے تحقیق کا دامن خاصا وسیع کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ مضمون جہاں مندرجہ بالا امور کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے وہیں اس کی آخری سطریں معنی خیز ہیں کہ کوئی بھی ادبی نظریہ مستقل نہیں ہوتا یہ خاص زمانے کی پیداوار ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ نظریات بدلتے ہیں۔ یہ سطور نہ صرف قدیم دور سے موجودہ دور تک کی ایک تاریخ بیان کرتی ہیں کہ پہلے کیا نظریات تھے اور اب کیا ہیں اور آنے والے دور میں کیا ہو سکتے ہیں بلکہ مصنفین، قارئین، محققین اور ناقدین کو ذہنی وسعت بھی عطا کرتے ہیں کہ انہیں اپنے ذہن کو آنے والے دور میں ہونے والی تبدیلیوں اور جدید ادبی رجحانات کے لیے تیار رکھنا چاہیے۔

محمد حسن عسکری کا شمار اردو کے جدید ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے "ستارہ یا بادبان" اور "انسان اور آدمی" خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ محمد حسن عسکری پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا مضمون "محمد حسن عسکری کی تنقید: اہم مباحث" ("دریافت" نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ: ۱۰، جنوری ۲۰۱۱ء) عسکری کے تنقیدی نظریات، ان کی تنقید کے پسِ منظر، تنقیدی بصیرت اور ان کے ہاں بدلتے ہوئے موضوعات سے بحث کرتا ہے۔ عسکری کا تنقیدی پسِ منظر بہت وسیع تھا وہ بودلیئر، فلابیئر اور مثالوں کے لیے جیمز جوائس، جی۔ ایچ لارنس اور مادام بواری جیسے مصنفین کا نام لیتے تھے:

> "ان کی تنقید کا ذہنی پسِ منظر مغرب کے بہترین اذہان، مشرقی جمالیات اور نقد کے تصورات سے مرتب ہوا ہے۔ ان پر عمر بھر فرانسیسی تنقید اور ادب کا غلبہ رہا۔ وہ اپنے ادبی تصورات کی توضیحات کے لیے بالعموم فرانسیسی شعراء اور ناول نگاروں کے نمونے پیش کرتے رہے ہیں۔"
>
> ۴۶

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے عسکری کے لیکچروں، مجموعہ محمد حسن عسکری سے مختلف اقتباس درج کرتے ہوئے ان کی تنقیدی ساخت، نظریات، دیگر نقادوں پر ان کے اثرات اور ہم عصروں سے انفرادیت کو واضح کیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں محمد حسن عسکری نے لکھنا چھوڑ دیا۔ ان کی زندگی کے آخری دس بارہ سال ادب سے دور تصوفانہ نہیں بلکہ مذہبی طرزِ زندگی میں گزرے انہوں نے مذہبی مضامین لکھے جو نوشہرہ کے ایک مدرسہ سے چھپتے تھے۔ "جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ" اسی دور کی یادہے جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو "محمد حسن عسکری کی تنقید: اہم مباحث" ان کے پورے ادبی کیریئر کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ان کے فن اور بدلتی ہوئی ذہنی اپج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مضمون کا مطالعہ ایک تنقیدی دبستان جس نے آنے والے دور کے بہت سے نقادوں کو متاثر کیا اور اردو تنقید کو روایت سے نکال کر اس پر جدید مثبت اثرات مرتب کیے اور ایک عہد ساز نقاد سے قاری کو متعارف کراتا ہے۔

تبصرے / اداریے:

تبصرہ نگاری ایک فن ہے جس میں کسی تحریر، تخلیق کو پڑھ کر اس کے سٹرکچر پر بات کی جاتی ہے۔ موجودہ دور میں اکثر رسائل و جرائد میں مختلف فن پاروں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسائل کی اکثریت ایسی ہے جن میں ایک حصہ "تبصرے" یا "رفتارِ ادب" کے عنوان سے شامل ہوتا ہے۔ رسائل کی اس روش نے تبصرہ نگاری کو روایت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بطور تبصرہ نگار کے مختلف کتب پر تبصرے لکھے ہیں۔ ان میں وہ بے باک اور غیر جانبدارانہ حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ "کلیاتِ قائم" مرتبہ اقتدا حسن پر تبصرہ (ادبِ لطیف، دسمبر ۱۹۶۴ء) کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جہاں محاسن کو بیان کیا ہے وہیں مرتب سے ہونے والی کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

> "قائم کا بحیثیت شاعر بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ صرف دس صفحات پر مشتمل ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ قائم جیسے شاعر جسے خود مرتب نے "صفِ اول کا شاعر" کہا ہے اس پر تنقید کا حق ادا کیا جاتا۔ قائم بحیثیت غزل گو، قصیدہ گو اور مثنوی نگار اہم مرتبہ رکھتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی حیثیت پر بھی تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی گئی۔"۴۷

حامد حسین حامد اور شمس الرحمن فاروقی نے "نئے نام" کے عنوان سے ہندوستان کے نئے شعراء کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں ان شعراء کا کلام شامل ہے جو ۱۹۶۰ء کے بعد سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "نئے نام" پر تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ: ۵۰، جنوری، ۱۹۷۰ء) کرتے ہوئے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء کے دوران پاکستان میں ہونے والی نئی شاعری اور اس کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک یہ شاعری نوجوانوں کے ذہنی، تہذیبی اور خارجی الجھنوں کی داستان ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "نئے نام پڑھتے ہوئے یہ احساس نمایاں ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نئے شاعر پاکستان کی نئی شاعری کی تحریک سے متاثر ہیں۔ مروجہ شعری لغت سے جس قدر بغاوت کا اظہار پاکستان کے شعراء نے کیا تھا، وہی اظہار ان شعراء کی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔"۴۸

بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مجموعہ "کلی اور کرن" پر لکھا گیا تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ: ۵۰، جنوری، ۱۹۷۰ء) بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بچوں کے لیے لکھنے والے شاعروں یا ادیبوں کی بچوں کی نفسیات سے گہری واقفیت پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک بچوں کے لیے لکھنے والے شاعر یا ادیب کا بچوں کی پسند ناپسند کا خیال اور انہی جیسا اندازِ نظر اور معصومیت اختیار کرنا ضروری ہے:

> "اس میں بچوں کے لیے بہت سی مفید نظمیں ہیں۔ موضوعات میں دنیا کی عظیم شخصیتیں، اخلاقی کہانیاں، مناظر فطرت اور پرندے شامل ہیں۔ مصنف کی یہ کاوش قابل قدر ہے۔ لیکن اس میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے، بچوں کی شاعری میں بے تکلفی، قربت اور معصومیت کی جو خاص فضا بنتی ہے، "کلی اور کرن" کی بہت سی نظموں میں نظر آتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی بچوں کے ذوقِ طبع کے مطابق نہیں۔"۴۹

ڈاکٹر وحید قریشی کے شعری مجموعہ "نقدِ جاں" پر تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ: ۴۴، جولائی، ۱۹۶۸ء) کرتے کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کی شاعری کے آغاز یعنی ۱۹۴۵ء سے "نقدِ جاں" کی اشاعت یعنی ۱۹۶۶ء تک کی شعری روایت کو مختصراً بیان کیا ہے۔ انہوں نے تبصرے میں "نقدِ جاں" میں شامل مختلف شعر اصناف کا ذکر کرتے ہوئے خصوصاً قطعات میں مقامی رنگ کی نشاندہی کی ہے:

> "قطعات میں بالخصوص پنجاب کے دیہاتی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان قطعات کی فضا میں سرسوں کے لہلہاتے ہوئے حسین کھیت ہیں، گاؤں کی لڑکیاں ترنجن میں گیت گا رہی ہیں اور خاموش چراگاہوں سے ہیر پڑھنے کی آواز آرہی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے قطعات خاصے متنوع ہیں، ان میں جذباتی واردات کا اظہار بھی ہے اور شہروں کی صنعتی زندگی کے بوجھ سے دم گھٹ جانے کا تجربہ بھی ہے۔"۵۰

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت "نقدِ جاں" سے مختلف اشعار کے انتخاب سے کی ہے۔ انہوں نے "نقدِ جاں" میں پائے جانے والے حیات وکائنات کے مسائل اور انسانی بے بسی کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ضیاء الحسن کی نظموں اور غزلوں کے مجموعہ "ازل سے" پر تبصرہ (ادبِ لطیف، شمارہ:۶،جون ۲۰۱۴ء) کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اسے نئے دور کے نئے شعری تجربہ کا بھرپور اظہار قرار دیا ہے۔ اس تبصرہ سے ان کا نئی غزل سے متعلق نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ جو روایتی عاشق، محبوب، ساقی، کوچہ محبوب اور شراب خانہ سے دامن چھڑا چکی ہے۔ تبصرہ کرتے ہوئے ان کا زیادہ رجحان نظموں کی نسبت غزلوں اور خصوصاً نئی غزل کی طرف رہا ہے۔ جب کہ نظموں پر مختصراً تبصرہ کیا ہے۔ نظموں کے متعلق لکھتے ہیں:

""ازل سے" کی نظموں میں پیار و محبت کی حرارت ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاعر ایک بڑے
کینوس پر حسن محبوب کو دکھاتا ہے۔ بے شمار نقش ہیں، جذبت ہیں، محسوسات ہیں اور ان سب
کو سمیٹ کر تسلسل کے ساتھ نقش گری کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔"۵۱

اب تک جتنے بھی تبصروں کا ذکر کیا گیا ہے یہ سب شعری مجموعوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا شعری ذوق، بصیرت اور جدید شعری رجحانات سے لگاؤ ظاہر ہوتا ہے۔ شعری مجموعوں کے علاوہ انہوں نے نثری کتب پر بھی تبصرے لکھے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیف "باغ و بہار-ایک تجزیہ" پر لکھے گئے تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب،لاہور، شمارہ:۴۴، جولائی،۱۹۶۸ء) میں اس تصنیف کی بعض اہم خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "باغ و بہار" کے کرداروں سے متعلق مصنف کے نقطۂ نظر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

آغا افتخار حسین کے مجموعہ مضامین "یورپ میں تحقیقی مطالعے" پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تبصرہ (ادب لطیف، شمارہ:۱/۱۹۶۸،۲ء) کرتے ہوئے ان مضامین کا تعلق سرزمین فرانس سے جوڑا ہے۔ مضمون "تحقیقی اداروں میں باہمی ربط کی ضرورت" میں اٹھائے گئے مسائل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

انیس ناگی کی تصنیف "نذیر احمد کی ناول نگاری" پر تبصرہ (ادب لطیف، شمارہ:۱/۱۹۶۸،۲ء) لکھتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اولاً اردو کے ناقدین کی محدود ناقدانہ صلاحیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ناقدین ناول پر تنقید کرتے ہوئے اپنے آپ کو محض قصہ، پلاٹ، کردار، ماحول اور مقصد تک محدود رکھتے ہیں۔ انہوں نے نذیر احمد کے ناقدین کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے انیس ناگی کو ان دونوں گروہوں سے الگ روایت سے انحراف کی مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر انہوں نے "نذیر احمد کی ناول نگاری" کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "انیس ناگی کا یہ تنقیدی کارنامہ جدید اردو تنقید میں ایک نئی جہت ہے۔ بلاشبعہ اسے گراں قدر اضافہ کہا جاسکتا ہے۔"۵۲

ڈاکٹر اکبر حیدری کی تصانیف "تحقیق و انتقاد" اور "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" پر لکھے گئے تبصرے ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب،لاہور، شمارہ:۴۹، اکتوبر،۱۹۶۹ء) بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے "تحقیق و انتقاد" میں شامل دو مقالے دو اہم کتابوں "انسائیکلوپیڈیا کا ناقدانہ جائزہ" اور "اردو لغات اور فرہنگ اثر (ایک جائزہ)" کا ذکر کرتے ہوئے مصنف کی دقتِ نظر، وسیع اور گہرے مطالعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "تحقیق و انتقاد" میں ڈاکٹر اکبر حیدری نے "فسانۂ آزاد" کے متعلق لکھا ہے کہ سرشار نے اسے عجلت میں غیر ذمہ داری سے لکھا ہے اور نظر ثانی نہیں کی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری تبصرے میں "فسانۂ آزاد" کے دوسرے ایڈیشن کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا ہے۔

"میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" پر تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب،لاہور، شمارہ:۴۹، اکتوبر،۱۹۶۹ء) لکھتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مرثیہ اور رزمیہ کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے دس ابواب پر مشتمل "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" میں کچھ تحقیقی و تکنیکی

غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے ثانوی ماخذ کو بنیاد بنایا ہے جب کہ بنیادی ماخذ موجود تھے۔ تکنیکی غلطیوں میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ابواب کی ترتیب کے حوالے سے کچھ اعتراضات اٹھائے ہیں۔

"تذکرہ ریاض الفردوس" (از محمد حسین شاہجہاں پوری، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل) پر تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ:۴۹، اکتوبر، ۱۹۶۹ء) لکھتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تذکرے کے تین حصوں عربی، فارسی اور اردو کا ذکر کیا ہے۔ مرتضیٰ حسین نے اردو کے حصہ کو مرتب کیا ہے۔ مصنف سے ہونے والی کوتاہیوں کو مرتب نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً سنین وفات اور پیدائش کا تحریری حوالہ نہیں ملتا اور نہ ہی سنین وفات اور پیدائش کے اندراج کا اہتمام ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ایسی ہی چند اور غلطیوں کی نشاندہی ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کی ہے۔

شب خون کتاب گھر، الہ آباد کی طرف سے شائع ہونے والے شمس الرحمن فاروقی کے مختلف کتابوں پر کیے گئے تبصروں کے مجموعہ "فاروقی کے تبصرے" پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ:۵۰، جنوری، ۱۹۷۰ء) خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں رسالہ "شب خون" کی تبصرہ نگاری کے حوالے سے خدمات اور تبصرہ نگاری کی روایت کے متعلق چند اہم اشارات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ تبصرہ نگاری کے فرائض اور شمس الرحمن فاروقی کی تبصرہ نگاری کی اہم خصوصیات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

عبدالقوی دسنوی کی تصنیف "علامہ اقبال بھوپال میں" پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ:۵۰، جنوری، ۱۹۷۰ء) اس تصنیف کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ساتھ ہی اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مصنف نے اقبال کے خطوط سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میرے خیال میں" پر لکھا گیا تبصرہ ("صحیفہ"، مجلس ترقی ادب، لاہور، شمارہ:۵۰، جنوری، ۱۹۷۰ء) خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کے اندازِ تنقید پر روشنی ڈالی ہے:

> "نظیر صدیقی کے مضامین میں یہ بات زیادہ متاثر کرتی ہے کہ وہ اردو کے عام نقادوں کی طرح اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت گول مول بات کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ بات یوں بھی ہو سکتی ہے اور اس طرح بھی۔ گویا ہر موقعہ پر قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش اور اپنے نقطۂ نظر میں گنجائش رکھ لینا ہمارے نقادوں کا شیوہ ہے۔ نظیر صدیقی اس روایتی انداز کے نقاد نہیں، ان کے مضامین پڑھنے کے بعد بے شمار مقامات پر ان کی رائے سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، اور اکثر موقعوں پر ان کے ذہنی تعصبات بھی جھانکتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ اس کے باوجود رائے میں وہ دوٹوک ہیں۔"۵۳

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تبصرہ لکھتے ہوئے جہاں نظیر صدیقی کی تنقیدی بصیرت پر بات کی ہے وہیں ان کے ہاں پائے جانے والے متعصبانہ لہجے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل مضمون "اردو ادب اور شعبہ اردو" کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس سے میں نظیر احمد صدیقی تعصب کا شکار نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بطور تبصرہ نگار کے غیر جانبداری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ شعری مجموعوں "کلیاتِ قائم"، "کلی اور کرن" جب کہ نثری کتب میں "تحقیق و انتقاد"، "میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر" اور "میرے خیال میں" پر لکھے گئے تبصرے ان کے غیر جانبدارانہ رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں انہوں نے تعریف و تحسین سے کام لیا ہے وہیں اعتراضات بھی اٹھائے ہیں اور اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے۔

اداریہ کسی ادبی، سیاسی، سماجی یا تہذیبی رسالے، پرچے یا میگزین کی پالیسی کا عکاس ہوتا ہے۔ اداریہ کسی مدیر کی رائے ہوتی ہے جو ایک خاص مدت کے لیے رسالے کا مدیر منتخب ہوتا ہے۔ اس کی یہ رائے ہمیشہ اس پرچے کی پالیسی پر مشتمل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری زمانۂ طالب علمی میں اسلامیہ کالج سول لائینز کے کالج میگزین کے مدیر رہے ہیں۔ ان کی ادارت میں نکلنے والے رسالوں کے اداریے کالج میگزین کی پالیسی کا واضح ثبوت ہیں۔ ان اداریوں میں کالج میگزین کی اشاعت میں درپیش مسائل کے علاوہ کچھ اہم معلومات بھی ملتی ہیں۔ مثلاً جون ۱۹۶۲ء کے شمارہ کا اداریہ نامور صحافی حمید نظامی کی وفات کی خبر دیتا ہے:

> "گزشتہ فروری میں پاکستان کے نامور صحافی جناب حمید نظامی صاحب کی ناگہانی وفات ایک قومی المیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم نے اپنی مادر علمی کے اس مایۂ ناز فرزند کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے فاران کے اس شمارے میں "بیادِ حمید نظامی" کے عنوان ایک باب قائم کیا ہے۔"۵۶

فروری ۱۹۶۳ء کے شمارہ کے اداریہ میں کوئی خاص معلومات نہیں ملتیں۔ اس میں کالج میگزین "فاران" کے تاخیر سے شائع ہونے کی وجوہات کا بیان ملتا ہے۔ "فاران" کا مئی ۱۹۶۳ء کا شمارہ بھی ڈاکٹر تبسم کاشمیری ہی کی ادارت میں نکلا۔ اس شمارہ کے اداریے میں کالج میگزین کے عجلت میں مرتب کرنے اور اس عجلت کی وجہ سے کالج میگزین کے مستقل فیچرز کے رہ جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اداریہ میں ڈاکٹر غلام علی چودھری کی تخلیق "پکی اینٹ" اور پروفیسر حمید احمد خاں کے خطبہ کی کالج میگزین میں شمولیت کی طرف بھی اشارات کیے گئے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، میر کی ابتدائی زندگی کے دانش مند بوڑھے، علامت، لاہور، شمارہ:۵، فروری ۱۹۹۹ء، ص:۲۲۶

۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، مصحفی و انشاء کا معرکہ، نقوش ادبی معرکے نمبر، لاہور، شمارہ:۱۲۷، جلد ۲، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص:۳۲۷-۳۲۸

۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، مصحفی بحیثیت نقاد اور تذکرہ نگار، مجلۂ تحقیق، لاہور، شمارہ:۲/۳/۴، ۱۹۸۳ء، ص:۸۴

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، غالب کی مغائرت۔ تفہیم غالب کا ایک دور، صحیفہ، لاہور، شمارہ:۸۵، اپریل، جون ۲۰۰۶ء، ص:۲۹

۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، بہادر شاہ ظفر۔ قفس" و "زنداں" کی علامتوں میں، علامت، لاہور، شمارہ:۶، مارچ ۲۰۰۰ء، ص:۱۸

۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، حالی اور نیا طرزِ احساس، قومی زبان، لاہور، شمارہ:۱، جنوری ۱۹۸۰ء، ص:۵

۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، حسرت ماضی اور حال، نگار (حسرت موہانی نمبر) کراچی، شمارہ:۴/۶، اپریل، جون ۱۹۷۶ء، ص:۲۷۹

۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، میر اجی کی شاعری کا آخری دور، ماہِ نو، لاہور، شمارہ:۵، مئی ۱۹۸۱ء، ص:۱۳

۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، میر اجی کی شاعری میں آرکی ٹائپل پیٹرن، ماہِ نو، لاہور، شمارہ:۱، ۱۹۸۷ء، ص:۱۴

۱۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، میر اجی اور جدید نظم کی تفہیم کا فریم ورک، بنیاد، لاہور، جلد چہارم، ۲۰۱۳ء، ص:۱۹۳

۱۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، راشد صدی: مسائل و افکار، بازیافت، لاہور، شمارہ:۱۸، جنوری، جون ۲۰۱۱ء، ص:۹۷

۱۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، راشد: تخاطب، خود کلامی اور مکالمے کی تکنیک، بنیاد، لاہور، شمارہ:۱، ۲۰۱۱ء، ص:۲۵

۱۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، تنقیدِ راشد، معیار، اسلام آباد، شمارہ:۶، جولائی، دسمبر ۲۰۱۱ء، ص:۲۴۱-۲۴۲

۱۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، مجید امجد: شاعری کے آخری دور کی معنویتبازیافت، لاہور، شمارہ:۲۴، جنوری، جون ۲۰۱۴ء، ص:۲۹۵

۱۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، ۱۸۸۷ء کی دو ڈرامہ کمپنیاں لاہور میں، قومی زبان، کراچی، شمارہ:۱۶، ۲ جولائی ۱۹۶۰ء، ص:۱۲

۱۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، اردو ڈرامہ، اندر سبھا سے پارسی تھیٹر تک، نئی قدریں، حیدر آباد، شمارہ:۲/۳، ۱۹۸۰ء، ص:۲۳۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۴۱

۱۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، پریم چند کا فنی شعور، فاران، لاہور: گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، شمارہ:۲، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص:۸

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۳

۲۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، منٹو کی وجودی اخلاقیات، تحقیقی زاویے، اسلام آباد، شمارہ:۱، جنوری، جون ۲۰۱۳ء، ص:۱۱۱

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۱۳

۲۲۔ بابو گوپی ناتھ: قحبہ خانوں کا راہب، از تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، غیر مطبوعہ (مخزونہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری)

۲۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، افسانے کا نیا افق، ماہِ نو، لاہور: شمارہ۹، ستمبر ۱۹۹۳ء، ص:۵

۲۴۔ ایضاً، ص:۸

۲۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، پاکستان کا پہلا اردو اخبار کوہ نور، فاران، لاہور: گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، شمارہ۲، مئی ۱۹۶۳ء، ص:۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص:۲۳

۲۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، لاہور پنچ لاہور کا ایک مزاحیہ اخبار، قومی زبان، کراچی، شمارہ:۱۰، ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء، ص:۳۳

۲۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، جدید جاپانی شاعری نیا دور، کراچی، شمارہ:۸۰/۷۹، مارچ ۱۹۸۵ء، ص:۳۹۷

۲۹۔ ایضاً، ص:۴۰۶

۳۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، یسز ابورو اوائے، ادبیات (بین الاقوامی ادب نمبر۳) اسلام آباد، شمارہ:۳۹/۴۰، ۱۹۹۷ء، ص:۴۰۳

۳۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اوکتاویو پاز، اوکتاویو پاز (ادبی اور تنقیدی مطالعہ)، مرتبہ: شگفتہ پروین، کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۵ء، ص:۱۱-۱۲

۳۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، سن ستاون کی ابتدائی بغاوتیں، اردو نامہ، لاہور، شمارہ:۱/۳/۴، جولائی ۲۰۰۹ء تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص:۱۵

۳۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، سن ستاون کی دلی، دریافت، اسلام آباد، شمارہ:۶، اگست ۲۰۰۷ء، ص:۵۰

۳۴۔ ایضاً، ص:۲۷

۳۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، انجمن پنجاب کی شعری تحریک کچھ نئی اطلاعات، بازیافت، لاہور، شمارہ:۱۲، جنوری، جون ۲۰۰۸ء، ص:۲۷-۲۸

۳۶۔ ایضاً، ص:۳۰

۳۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، آزاد کا عالمِ دیوانگی، تخلیقی ادب، اسلام آباد، شمارہ:۷، جون ۲۰۱۰ء، ص:۱۲

۳۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، محمد حسین آزاد: جنون اور رسائل جنون، جرنل آف ریسرچ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان: شمارہ۱۷، جون ۲۰۱۰ء، ص:۴

۳۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور تھیوڈور بیک، نئی قدریں، حیدر آباد، شمارہ:۵/۶، ۱۹۸۱ء، ص:۲۱

۴۰۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو تحقیق کا ابتدائی دور (سر سید احمد خان)، بنیاد، لاہور، شمارہ ۲۰۱۲، ۲ء، ص:۲۴

۴۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر،، ولیم فریزر کا قتل، نواب شمس الدین اور لوک گیت فریجن، دریافت، اسلام آباد، شمارہ:۵، ۲۰۰۶ء، ص:۶۳

۴۲۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، پروفیسر حمید احمد خاں-چند تاثرات، فاران (یادگار نمبر) لاہور، شمارہ: ندارد، مارچ ۱۹۷۵ء، ص:۳۸

۴۳۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، محقق گر محقق، مخزن (وحید قریشی نمبر)، لاہور، شمارہ:۱۹، ۲۰۱۰ء، ص:۳۰

۴۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، شہزاد صاحب، مخزن (شہزاد احمد نمبر) لاہور، شمارہ:۲، ۲۰۱۲ء، ص:۷۰

۴۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، "رشید حسن خاں اور تحقیق کا کلٹ "(Cult) بازیافت، لاہور، شمارہ:۲۲، جنوری، جون ۲۰۱۳ء، ص:۴۳

۴۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، محمد حسن عسکری کی تنقید: اہم مباحث، دریافت، اسلام آباد، شمارہ:۱۰، جنوری ۲۰۱۱ء، ص:۱۱۷

۴۷۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، "تبصرہ کتب" کلیات قائم(دو جلدیں)، مرتبہ: اقتدا حسن،ادب لطیف،لاہور، شمارہ:ندارد، دسمبر ۱۹۶۶ء، ص:۱۱۹

۴۸۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، "تبصرہ کتب" نئے نام، مرتبین: شمس الرحمن فاروقی، حامد حسین حامد، صحیفہ،لاہور: شمارہ ۵۰، جنوری ۱۹۷۰ء، ص:۱۶۴

۴۹۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، تبصرہ کتب، کلی اور کرن، از اطہر راز، صحیفہ،لاہور: شمارہ ۵۰، جنوری ۱۹۷۰ء، ص:۱۶۸-۱۶۹

۵۰۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، تبصرہ کتب، نقد جاں، از ڈاکٹر وحید قریشی، صحیفہ،لاہور، شمارہ:۴۴، جولائی ۱۹۶۸ء، ص:۲۰۴-۲۰۵

۵۱۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، تبصرہ کتب، ازل سے، از ضیاء الحسن، ادب لطیف،لاہور، شمارہ:۶، جون ۲۰۱۴ء، ص:۲۹۳

۵۲۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، تبصرہ کتب، نذیر احمد کی ناول نگاری، از انیس ناگی، ادب لطیف،لاہور، شمارہ:۱/ ۲، سال نامہ ۱۹۶۸ء، ص:۳۲۳

۵۳۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، تبصرہ کتب، میرے خیال میں، از نظیر صدیقی، صحیفہ،لاہور، شمارہ:۵۰، جنوری ۱۹۷۰ء، ص:۱۶۹

۵۴۔ تبسم کاشمیری،ڈاکٹر، اداریہ، فاران،لاہور: گورنمنٹ اسلامیہ کالج، سول لائنز، جون ۱۹۶۲ء

References in Roman Script:

1. Tabassum Kashmiri, Dr., Meer Ki Ibtdai Zindgi Kay Danishmand Baodhay, Alamat, Lahore, Issue: 5, February 1999, p: 226

2. Tabsum Kashmiri, Dr.,Mushafi-o-Insha Ka Maarka, Naqoosh Adabi Marake No., Lahore, Issue: 127, Volume 2, September 1981, pp: 327-328

3. Tabsum Kashmiri, Dr., Mushafi Ba-hasiat Naqad aur Tazkira Nigaar, Research Magazine, Lahore, Issue: 2/3/4, 1983, p:84

4. Tabassum Kashmiri, Dr., Ghalib ki Mugairat-Tafheem Ghalib ka Aik Door, Safiha, Lahore, Issue: 85, April, June 2006, p: 29

5. Tabsum Kashmiri, Dr., Bahadur Shah Zafar, Qafas-o-Zindan, Ki Alamat,Alamat, Lahore, Issue: 6, March 2000, p: 18

6. Tabsum Kashmiri, Dr., Hali aur Naya Tarz-e-Ehsaas,Qaumi Zuban, Lahore, Issue: 1, January 1980, p: 5

7. Tabsum Kashmiri, Dr., Hasrat Maazi aur Haal, Nagar (Hasrat Mohani No.) Karachi, Issue: 4/6, April, June 1976, p: 279

8. Tabassum Kashmiri, Dr., Meera G Ki Shairi ka Akhri Door, Mah-e-Nou, Lahore, Issue: 5, May 1981, p: 13

9. Tabassum Kashmiri, Dr., Meera G ki Shairi Mien Archetypal Patterns, Mah-e-Noo, Lahore, Issue: 1, 1987, p: 14

10. Tabsum Kashmiri, Dr.,Meera G aur Jadeed Nazm ki Tafheem ka Framework,Bunyad, Lahore, Vol.

11. Tabsum Kashmiri, Dr., Rashid Siddi:Masail-o-Afkaar,Bazyaft, Lahore, Issue: 18, January, June 2011, p: 97

12. Tabsum Kashmiri, Dr., Rashid:Takhatub, Khud Qalami aur Makalmay technique,Bunyad, Lahore, Issue: 1, 2011, p: 25

13. Tabassum Kashmiri, Dr., Naqeed-e-Rashid,Mayaar, Islamabad, Issue: 6, July, December 2011, pp: 241-242

14. Tabsum Kashmiri, Dr., Majid Majid:Shairi Kay Akhri Door ki Manwiat,Bazyaft, Lahore, Issue: 24, January, June 2014, p: 295

15. Tabsum Kashmiri, Dr.,1887 ki do Darama Compniyan,Qaumi Zuban, Karachi, Issue: 2, 16 July 1960, p: 12

16. Tabsum Kashmiri, Dr., Urdu Drama, From Indrasabha se Parsi Theatre tak,Nai Qadrien, Hyderabad, Issue: 2/3, 1980, p: 238

17. Ibid, p: 241

18. Tabsum Kashmiri, Doctor, Premchand ka Fani Shaoor, Faraan, Lahore: Government Islamia College Civil Lines, Issue: 2, December 1960, p: 8

19. Ibid, p:13

20. Tabsum Kashmiri, Ph.D., Minto ki Wajoodi Akhlaquyat,Tahqeeqi Zawye, Islamabad, Issue: 1, January, June 2013, p: 111

21. Ibid, p:113

22. Babu Gopinath: Qabha Khano Ka Rahab az Tabsum Kashmiri, Dr.,Gair Matbooa (Makhuzona,Dr. Tabsum Kashmiri)

23. Tabassum Kashmiri, Dr.,Afsanay ka Naya Ofaq, Mah-e-Nou, Lahore: Issue 9, September 1993, p: 5

24. Ibid, p:8

25. Tabsum Kashmiri, Dr., Pakistan ka Pahla Akhbar Koh-e-Noor, Faraan, Lahore: Government Islamia College Civil Lines, Issue 2, May 1963, p:18

26. Ibid, p:23

27. Tabsum Kashmiri, Dr., Lahore Punch Lahore ka aik mazahya Akhbar,Qaumi Zuban, Karachi, Issue: 10, 16 May 1960, p: 33

28. Tabsum Kashmiri, Dr.,Jadeed Japani Shairi, New York, Karachi, Issue: 80/79, March 1985, p:397

29. Ibid, p: 406

30 Tabsum Kashmiri, Dr., Kenza Boroway,Adbiyaat (Bain-ul-aqwami Adab No. 3), Islamabad, Issue: 39/40, 1997, p: 403

31. Tabsum Kashmiri, Ph.D., Okta View Paws, Okta View Paws (Adbi aur Tanqidi Mutala), Murtaba: Shagufita Parveen, Karachi: Book Time, 2015, pp: 11-12

32. Tabassum Kashmiri, Dr.,San Satawn ki Dili, Urdu Nama, Lahore, Issue: 1/3/4, July 2009 to March 2010, p: 15

33. Tabsum Kashmiri, Dr., Sun Seventeen Ki Delhi,Daryaft, Islamabad, Issue: 6, August 2007, p: 50

34. Ibid, p: 72

35. Tabassum Kashmiri, Dr., Anjumn Punjab Ki sheri Tahreek kuch nai Itlaa,Bazyaft, Lahore, Issue: 12, January, June 2008, pp: 27-28

36. Ibid, p:30

37. Tabsum Kashmiri, Dr., Azad ka Alam-e-Dwangi,Takhliqi Adab, Islamabad, Issue: 7, June 2010, p: 12

38. Tabsum Kashmiri, Dr., Muhammad Hussain Azad:Janoon aur Risail Janoon, Journal of Research, Bahauddin Zakaria University, Multan: Issue 17, June 2010, p: 4

39. Tabsum Kashmiri, Dr., Sir Syed Ahmad Khan aur Theo Dorbeck,Nai Qdrien, Hyderabad, Issue: 5/6, 1981, p:21

40. Tabsum Kashmiri, Dr.,Urdu Tahqeeq Ka Ibtadai Door (Sir Syed Ahmad Khan),Bunyad, Lahore, Issue 2, 2012, p: 24

41. Tabsum Kashmiri,Dr. William Fraser Ka Qatal, Nawab Shamsuddin aur Lok Geet Farijn, Daryaft, Islamabad, Issue: 5, 2006, p: 63

42. Dr. Tabsum Kashmiri, Prof. Hameed Ahmed Khan Chand Tasuraat, Faraan (Yaad Gaar Number), Lahore, Issue: Nadard, March 1975, p: 38

43. Tabsum Kashmiri, Doctor,Mohaqiq Gar Mohaqiq. Makhzan (Waheed Qureshi No.), Lahore, Issue: 19, 2010, p: 30

44. Dr. Tabsum Kashmiri, Shehzad Sahib, Makhzan (Shehzad Ahmad No.) Lahore, Issue: 2, 2012, p: 70

45. Tabsum Kashmiri, Dr., "Rashid Hasan Khan aur tahqeeq ka Kalap",Bazyaft, Lahore, Issue: 22, January, June 2013, p: 43

46.Tabassum Kashmiri, Dr. Muhammad Hasan Askari ki Tanqeed, Daryaft, Islamabad, Issue: 10, January 2018, p: 117.

47. Tabsum Kashmiri, Dr., "Tabsra Kutab" Kaliat-e-Qaim (Do Jildien), Iqtada Ahsan, Adab-e-Latif, Lahore, Issue: Nadard, December 1966, p: 119

48. Tabsum Kashmiri, Dr., "Tabsara Books" Naye Naam,Muratbeen: Shamsur Rahman Farooqi, Hamid Hussain Hamid, Sahifa, Lahore: No. 50, January 1970, p: 164

49. Tabsum Kashmiri, Dr.,Tabsara, Kali and Kiran, az Athar Raz, Sahifa, Lahore: Issue 50, January 1970, pp: 168-169

50. Dr. Tabsum Kashmiri,Tabsara Kutab, Naqd-e-Jaan, az Dr. Waheed Qureshi, Sahifa, Lahore, Issue: 44, July 1968, pp: 204-205

51. Tabsum Kashmiri, Dr.,Tabsara Kutab,Azal se,az Zia-ul-Hasan, Adab-e-Latif, Lahore, Issue: 6, June 2014, p: 293

52. Tabsum Kashmiri, Dr.,Tabsara Books, Nazir Ahmad ki Novel Nigari,az Anees Nagi, Adab-e-Latif, Lahore, Issue: 1/2, Year 1968, p: 323

53. Tabassum Kashmiri, Dr.Tabsara Kutab,Mairay Khyal Mien, az Nazir Siddiqui, Sahifa, Lahore, Issue: 50, January 1970, p: 169

54. Tabsum Kashmiri, Ph.D.,Idariya, Faraan, Lahore: Government Islamia College, Civil Lines, June 1962.